

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ

یہ وہ کتاب ہے جس کے کلام الہی ہونے میں ذرا بھی شک نہیں

3031

# معجزہ قرآن مجید

یعنی

قرآن مجید کے لفظاً اور معنیاً کلام الہی اور معجزہ ہونے کا ناقابل تردید

واقعات اور دلائل سے

کامل ثبوت

اعجاز قرآن مجید کو واضح کر نیوالی اپنی قسم کی پہلی کتاب

نوشتہ

خان بہادر مولوی ادریس احمد پٹی ایس (ریٹائرڈ)

ہمدیا سٹر اسلامیہ ہائی اسکول بریلی

جلد غیر مکتوبہ

۱۹۳۳ء

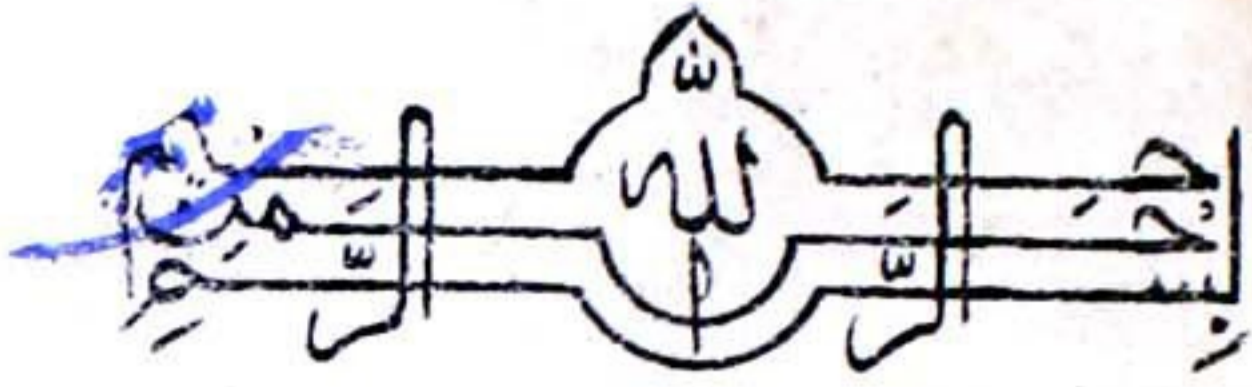
بار اول ۱۵۰۰ جلد

# فہرست مضامین

صفحہ ۳۰		(۱) تمہید
۱۲	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت	(۲) پہلا باب
۶۰	کلام الہی کی بے نظیر فصاحت و بلاغت	(۳) دوسرا باب
۷۷	قرآن مجید کی بے مثل تاثیر	(۴) تیسرا باب
۹۷	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتیت بھی	(۵) چوتھا باب
	قرآن مجید کا اعجاز	
۱۰۷	قرآن مجید کی پیشین گوئیاں	(۶) پانچواں باب
۱۳۴	قرآن مجید کی تعلیم و ہدایت	(۷) چھٹا باب
۱۷۵	بعض ان امور کا ذکر جو انسانی عقل کی گرفت	(۸) ساتواں باب
	سے باہر ہیں	
۲۰۸	عرض مدعا	(۹) آٹھواں باب
۲۳۵		(۱۰) ختمہ



بسم الله الرحمن الرحيم  
ادرس  
تو  
ان  
بسم الله الرحمن الرحيم  
بسم الله الرحمن الرحيم



## تہذیب و

بائبل جو ہندوستان کے تمام مشن اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے اس میں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید یعنی تورات اور انجیل دونوں شامل ہوتی ہیں۔ وہ اصل الفاظ اور وہ زبان جس میں تورات اور انجیل نازل ہوئی تھیں مدت ہوتی کہ دنیا ان سے محروم ہو گئی ان کتب سماوی کے قدیم قلمی نسخوں کا دنیا میں کہیں وجود باقی نہیں رہا اب صرف ان کے ترجمے مروج ہیں۔ تورات کا عبرانی زبان میں سب سے پرانا قلمی نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے وہ نوپن صدی عیسوی کا لکھا ہوا ہے۔ اور انجیل کا کوئی قلمی نسخہ چوتھی صدی عیسوی سے پیشتر کا دنیا میں موجود نہیں ہے۔

مسزید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی مشہور و معروف

کتاب خطبات احمدیہ سوم و کم میور کی کتاب لائف آف محمد کے  
جواب میں بہت سی تحقیق و تفتیش کے بعد زمانہ قیام لندن تصنیف فرمائی  
کھتی اس کتاب کے دسویں خطبہ میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ

جب قرآن مجید میں یہ پایا گیا کہ توریت اور انجیل میں ہمارے  
پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر موجود ہے اور آپ کا  
لقب بھی مذکور ہے تو مسلمان علمائے توریت و انجیل ہیں اس کی تلاش  
شروع کی مگر انھوں نے عہد عتیق اور عہد جدید کی کتابوں کو نہایت  
اترا اور پریشان حالت میں پایا کیونکہ کوئی اصلی نسخہ توریت اور انجیل  
کا دنیا میں موجود نہ تھا۔ اور جس قدر نقلیں موجود تھیں وہ آپس میں  
نہایت مختلف تھیں اور ان کے جو ترجمے مشرقی زبانوں میں ہوئے تھے  
ان میں باہم اس قدر اختلاف تھا کہ ان کی نسبت یہ خیال ہی نہیں  
ہو سکتا تھا کہ یہ سب ایک ہی اصلی کتاب کے ترجمے ہیں۔

توریت اور انجیل کے متعلق یہودیوں اور عیسائیوں کا مسلمانوں کی طرح عقیدہ  
نہیں ہے کہ وہ کلام الہی ہیں بلکہ دونوں مذہب کے علما اس بات کو تسلیم  
کرتے ہیں کہ انبیاء بنی اسرائیل پر سوائے احکام عشرہ حضرت موسیٰ کے  
جو وحی آتی تھی اس کے الفاظ وہ نہیں ہوتے تھے جو توریت و زبور  
اور صحف انبیاء میں لکھے ہوئے تھے بلکہ ان کا صرف مطلب لقا ہوتا تھا

پھر وہ اس کو اپنی زبان اور محاورہ میں لوگوں کے سامنے بیان کر دیا کرتے تھے  
 اناجیل اربعہ یعنی مٹی کی انجیل، قریش کی انجیل، نوحا کی انجیل اور یوحنا  
 کی انجیل جو اب عیسائیوں میں مستند اور مقدس تسلیم کی جاتی ہیں اور گرجاؤں  
 میں پڑھی جاتی ہیں۔ ان کے متعلق کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں ہے آپ  
 انبار کے دن کسی گرجا میں پہنچ کر پادری صاحب سے انگریزی زبان میں مولی  
 پاپیل (مقدس انجیل) مانگا لیجیے۔ اور تورات کے بعد انجیل کا سرورق  
 ملاحظہ فرمائیے۔ اس پر آپ کو انگریزی زبان میں یہ عبارت چھپی ہوئی ملے گی

ہر مجسٹی شہنشاہِ معظم کے مخصوص حکم سے ہمارے مولے اور نجات دہندہ  
 حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ عہد نامہ جدید "صلی" یونانی زبان سے  
 ترجمہ کیا گیا ہے اور بیشتر جس قدر ترجمے ہو چکے ہیں ان سے محنت

کے ساتھ اس کا مقابلہ کر کے نظر ثانی (ترمیم) کی گئی ہے۔ Revised

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ عیسائی علماء ان اناجیل اربعہ کا اصلی ماخذ  
 (original) یونانی زبان کی انجیل تسلیم کرتے ہیں یعنی عبرانی زبان  
 کی انجیل جو حضرت عیسیٰ کی زبان میں بذریعہ روح القدس حضرت عیسیٰ  
 پر نازل ہوئی تھی ان عیسائیوں کے کبھی ہاتھ ہی نہیں لگی اس وقت دنیا میں  
 عبرانی زبان کی انجیل کا وجود درکنار اس کا کہیں مفصل تذکرہ بھی نہیں پایا  
 جاتا۔ بلکہ سب عیسائی علماء بالاتفاق اصل بائبل یونانی زبان ہی میں تسلیم

کرتے چلے آئے ہیں۔ اور ان کی تذکرہ اور تاسیخ کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے دوسری بات یہ ہے کہ وہ زمانہ حال کے ترجمہ کی بابت اقرار کرتے ہیں کہ پچھلے تمام ترجموں کی روشنی میں اس پر نظر ثانی کی گئی ہو۔ نظر ثانی (Revision) میں ترمیم اور اصلاح کا تصور غالب ہوتا ہے۔ لہذا صاف ظاہر ہے کہ پچھلے ترجمے باہم مختلف ہیں۔ اور مروجہ ترجمہ ان کی اصلاح شدہ صورت ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ اب سرورق اٹلیٹے سب سے پہلے مٹی کی انجیل ہے۔ اس کا عنوان ملاحظہ کیجئے۔ اس کا اردو ترجمہ ہے "انجیل بوجب" یا حسب منشاء مقدس مٹی کے According to S, Mat new یہی الفاظ باقی تین انجیلوں کے عنوان میں بھی درج ہیں۔ عنوانوں کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کے ان حواریوں نے خود نہیں لکھی ہیں جن کے نام سے وہ منسوب ہیں ورنہ لفظ "بوجب" یا حسب منشاء کے اضافہ کی مطلق ضرورت ہی نہ تھی۔ چار جدا جدا انجیلوں کا وجود ہی بجائے خود یہ امر تسلیم کرنے کے لیے کافی تھا کہ یہ چار شخصوں کی لکھی ہوئی ہیں۔ عنوان میں جبریت مصنف صرف ان کا نام کافی ہوتا۔

بہر حال یہ واقعہ ہمارے اور عیسائیوں کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ یہ چاروں انجیلیں نہ تو حضرت عیسیٰ پر بذریعہ وحی نازل ہوئیں۔ نہ حضرت

عیسے کی تصنیف ہیں۔ نہ ان کے عہد میں لکھی گئیں اور اس واقعہ سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت عیسے کی زبان عبرانی تھی۔ لہذا جو انجیل آپ پر نازل ہوئی اور جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور جس کے مختصر حوالے انجیل اربعہ میں بھی پائے جاتے ہیں یقیناً عبرانی زبان میں تھی جس کا کوئی نسخہ اس وقت دنیا میں موجود نہیں۔

اب ایک اور لطف کی بات یہ ہو کہ منجملہ ان چار مقدس بندگوں کے جن سے انجیل اربعہ منسوب ہیں۔ صرف دو یعنی متی اور یوحنا تو حضرت عیسے کے حواری تھے۔ باقی دو یعنی مرقس اور لوقا کو تو حضرت پی کی کبھی صحبت بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مرقس تو پطرس حواری کے شاگرد تھے اور عیسائی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ مرقس نے حضرت مسیح کے حالات پطرس حواری سے معلوم کیے تھے۔ اب رہ گئے لوقا ان کے اُستاد و مقدس پوپس بھی حضرت عیسے کے حواری نہ تھے۔ غرض حضرت عیسے کے عہد سے ایک عرصہ کے بعد لوگوں نے حضرت عیسے کے حالات اور ان کے معجزات اور ہند و نصائح آپ کے حواریوں اور حواریوں کے شاگردوں سے معلوم کر کے قلمبند کر دیئے۔

اب ذرا قرآن مجید کی طرف توجہ کیجئے۔ اس کتاب اللہ نے ایک بار نہیں، دو بار نہیں بلکہ متعدد بار کمال شہادت سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں



کلامِ الہی ہوں۔ بے مثل ہوں۔ بے مانند ہوں کسی جن و بشر کی مجال  
 نہیں کہ میرے ایک چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی مانند بھی اپنا کلام پیش  
 کر سکے۔ دوسری طرف ہر مسلمان کا یہ سچا عقیدہ اور یقین ہو کہ قرآن مجید  
 لفظاً اور معنیاً اول سے لیکر آخر تک سب اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو وقتاً فوقتاً  
 بذریعہ وحی نبی آخر الزماں صلعم پنازل ہوا تھا۔ اس میں ایک لفظ ایک حرف  
 بلکہ ایک نقطہ کا بھی فرق نہیں ہے۔ نظر بہ حالات و دنیا میں اس سے زیادہ  
 حیرت انگیز اور کیا واقعہ ہو سکتا ہے کہ بائبل تو تمام دنیا کی درسگاہوں  
 میں ابتدائی درجہ سے لیکر انتہائی درجوں تک اصل پڑھائی جاتی ہے مگر  
 قرآن مجید دنیا کے کسی اسکول اور کالج اور یونیورسٹی میں بطور مذہبی سیٹ  
 اب کے نہیں پڑھایا جاتا۔ حیرت پر حیرت ایک اور یہ ہے کہ بائبل پڑھانے  
 کے لئے دنیا کے بڑے بڑے عیسائی علماء فضلاء اور محققین نے اپنی زندگیاں  
 وقف کر دی ہیں۔ ہندوستانی طلباء کو صرف بائبل کا متن پڑھانے اور  
 سمجھانے کی غرض سے انگلستان اور امریکہ سے ہزاروں میلوں کا سفر طر  
 کر کے بڑے بڑے نامور اور سندا یافتہ پادری صاحبان ہندوستان  
 تشریف لاتے ہیں۔ اور صرف بائبل پڑھاتے پڑھاتے اس غیر ملک میں  
 اپنی عمریں ختم کر دیتے ہیں۔ مگر مجھے غالباً اپنی بدقسمتی سے کسی ایسے مسلمان  
 عالم کا نام معلوم نہیں ہے جس نے صرف قرآن مجید کی تعلیم دینا اپنی زندگی کا

مقصد قرار دیا ہو۔ اور اپنی زندگی صرف قرآن مجید پڑھانے میں بسر کی ہو  
 ہندوستان میں قرآن مجید عموماً بچپن میں بغیر ترجمہ کے تبرا کا پڑھا یا  
 جاتا ہے۔ اور اس کے پڑھانے والے جس دل و دماغ اور جس پایہ اہمیت  
 کے لوگ ہوتے ہیں سب کو معلوم ہے۔ اور اب چونکہ تمدنی اور اقتصادی  
 حالات کے اقتضا سے کسب معاش کی جدوجہد جوں جوں مشکل ہوتی  
 جاتی ہے اسی قدر مذہب کی گرفت قلوب پر بتدریج ڈھیلی ہوتی جا رہی  
 ہے۔ اور بچپن میں تبرا کا قرآن پڑھانے کا وہ رواج بھی رفتہ رفتہ معدوم  
 ہوتا جا رہا ہے۔

گزشتہ تیس سال میں میرا مختلف درسگاہوں سے تعلق رہا ہے۔ کم و  
 بیش دس سال علی گڑھ کے شہرہ آفاق مدرسۃ العلوم (ایم۔ اے۔ ایو کالج)  
 میں رہنے کا موقع ملا۔ اور بہ حیثیت اسٹنٹ سکریٹری کالج کے اس نامور  
 درسگاہ کے نظم و نسق سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اور چھلے بیس برس میں بہ حیثیت  
 ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اسکولوں اور اسلامیہ اسکولوں کے حالات کا مطالعہ  
 کرتا رہا ہوں۔ علی گڑھ کالج کی امتیازی خصوصیت یہی سمجھی جاتی تھی کہ  
 وہ مسلمانوں کی اپنی درسگاہ ہے۔ اور اس میں مسلمان طلباء کی مذہبی تعلیم کا  
 بھی انتظام ہے۔ اسلامیہ اسکولوں کا یہی طرہ امتیاز ہے وہی تعلیم کا انتظام  
 سمجھا جاتا ہے۔

مگر طویل تجربہ کے بعد میرا یہ خیال ہے کہ سپاک اسکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلباء کی دینی تعلیم کا کوئی اہم نصب العین مسلمانوں کے کبھی پیش نظر نہیں ہوا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ نہ تو اس ملک کے مسلمانوں نے من حیث النعم کوئی معین دینی نصاب تعلیم مرتب کیا۔ نہ موزوں مذہبی معلموں کی تیاری اور فراہمی کی طرف کبھی توجہ کی۔

اس وقت ہندوستان کے مختلف حصوں میں جو جو دینی نصاب تعلیم مروج ہیں ان میں سے بیشتر میرے پیش نظر ہیں کسی نصب العین کی عدم موجودگی میں نصاب تعلیم میں اختلاف اور انتشار لازمی تھا۔ جو نصاب میں دیکھے ان کا مشترک حصہ چند فقہی مسائل ہیں۔ اور حال میں سیرت نبوی کی طرف کچھ کچھ توجہ مبذول ہوتی جا رہی ہے۔

تعلیم کا جزو موثر معلم کی ذات ہوتی ہے۔ لہذا سپاک اسکولوں اور کالجوں میں دینی تعلیم کے مسئلہ کا حل بہت کچھ دینیات کے موزوں معلموں کی دستیابی پر منحصر ہے۔ جب سائنس۔ ریاضی۔ تاریخ۔ جغرافیہ فلسفہ منطق اقتصادیات اور زبانوں کی تعلیم کے واسطے جدا جدا اوصاف کے تربیت یافتہ معلموں کی ضرورت اور تلاش ہوتی ہے تو کیا مذہب ایسا گیا گزرا مضمون ہے کہ اس کے معلم کے لیے کسی وصف کی ضرورت نہیں اور شخص اس کی تعلیم دینے کا اہل تسلیم کیے جانے کے قابل ہے۔

رہ گیا نصب العین اور ایک موزوں نصاب تعلیم کا مسئلہ۔ یہ  
 علماء دین اور اسکا بر قوم کی سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔  
 تمام اعلیٰ اور اونی عیسائی درسگاہوں میں اصل بائبل کی تعلیم  
 ہوتے ہوئے دیکھ کر فطرتاً میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی  
 درسگاہوں خصوصاً مشرقی علوم کی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں  
 اصل قرآن مجید کو کیوں دخل نہیں کیا گیا۔

اس سوال کا کوئی شافی جواب مجھے اس وقت تک معلوم نہیں ہوا  
 میرا یہ ایک المناک تجربہ ہوا کہ اسکولوں کے مسلمان طلباء کو عموماً یہ توجہی  
 معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کی انگریزی نہایت فصیح اور میں ہو جس کو سلیبس  
 انگریزی زبان پیکھنا مقصود ہو وہ بائبل کی عبارتیں حفظ یاد کرے مگر  
 شاذ و نادر ایسے طلباء دیکھنے میں آئے جن کو قرآن مجید کی امتیازی  
 خصوصیات کا واجب علم ہو۔ ہماری بے مثل مذہبی کتاب ہونے کی  
 حیثیت سے ہر مسلمان کے دل میں قرآن مجید کی عظمت اور وقعت ہے  
 مگر اس کتاب الہی کے اعجاز کی دلکش تفصیلات سے بہت کم مسلمان  
 واقف ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب سے میرا مقصد یہ ہے کہ میں قرآن مجید کے  
 متعلق کچھ ایسے معلومات طلباء کے سامنے پیش کروں جو غالباً اس تفصیل

کے ساتھ ان کے پیش نظر نہیں ہیں جب وہ واقف ہوں گے کہ ان کی مقدس کتاب کیسے کیسے حیرت انگیز عجائبات اور نادور کمالات پر مشتمل ہو تو وہ فطرتاً اس کی حقیقی شان سے متاثر ہوں گے اور کم سے کم ان کے دلوں میں اس کتاب کا حقیقی وقار پیدا ہوگا۔ میں نے اس کتاب میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں لکھی بلکہ صرف اپنے علمائے کرام اور بعض مسلمانوں اور یورپین محققین کی تصانیف سے خوشہ چینی کی ہے۔ مثلاً مولانا سیلابیان صاحب ندوی کی سیرت نبوی جلد سوم شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم اور مولانا شرف علی صاحب کا ترجمہ قرآن مجید۔ سرسید احمد خاں صاحب مرحوم کی کتاب خطبات احمدیہ۔ خلیفہ سید محمد حسن خاں صاحب مرحوم کی اعجاز التنزیل۔ مولانا محمد علی صاحب۔ ایم۔ اے لاہوری کا ترجمہ قرآن مجید۔ مولانا عبدالحق صاحب ہلوی کا مقدمہ تفسیر حقانی بمسٹر گارڈ فریگمنس کی کتاب اپالوچی فار محمد۔ سرو لیم میور صاحب کی کتاب لائف آف محمد۔ پروفیسر محمود علی صاحب کی کتاب دین و دانش۔ ایڈورڈ وٹکین کی تاریخ زوال سلطنت روما وغیرہ

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہیے کہ میں نے صرف ایک حقیر شہد کی نگہی کی طرح مختلف پھولوں میں سے شہد کے چند قطرے سے اخذ کر کے ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق یہ معلومات چونکہ یکجائی طور پر اور کسی کتاب میں  
اب تک دیکھنے میں نہیں آئے تھے اس لیے میں نے خود یہ رسالہ مرتب  
کرنے کی جرات کی ہو۔ میرے مخاطب زیادہ تر اسکولوں اور کالجوں  
کے مسلمان طلبا ہیں۔ اگر ان طلبا اور ان کے والدین اور سرپرستوں نے  
میری اس کوشش کو نظر قبول سے دیکھا تو بشرط زندگی میرا ارادہ ہو کہ اسی سلسلہ  
میں خاص طلبا کے لیے اور کئی رسالے مرتب کروں جن میں دین اسلام  
کے دلفریب اور دلکش پہلوؤں کو اسی طرح جدا جدا نمایاں کیا جائے گا۔ اللہ  
تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی توفیق میرے شامل حال ہو۔ آمین

خاکسار

اوریس احمد

بریلی مورخہ یکم مارچ ۱۹۳۳ء

# پہلا باب

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت

(دل و جانم فدائے ہاشم باد)

مسئلہ تاریخی واقعات اور مستند شہادتوں سے آنحضرت صلیعہ کی

رسالت کی تصدیق

اس کتاب کا مقصد ناقابل انکار واقعات اور دلائل سے یہ ثابت کرنا ہے کہ قرآن مجید لفظاً اور معنماً اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور ہذا وہ اپنی تمام خصوصیات کے لحاظ سے بے مثل اور بے نظیر ہے۔ اور کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اس کلام کے ایک چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے کی مانند دوسرا کلام پیش کر سکے لیکن کلام الہی کی اہمیت اور عظمت ذہن نشین ہونے کے لیے رسول خدا صلیعہ کی سیرت مبارک سے شناسائی ضروری ہے جن کے ذریعہ سے یہ کلام ہم تک پہنچا۔ کیونکہ پیام کی وقعت پیام بر کی حیثیت سے بہت کچھ وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کسی طرح یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ رسول ہے ہیں۔ راستباز ہیں۔ اور تمام نیک صفات سے منصف ہیں اور ان کے رشتہ دار اور دوست احباب

ہی نہیں بلکہ اعیار اور مخالف بھی آپ کو سچا اور راست باز سمجھتے ہیں۔ تو پھر یہ باور کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ آپ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں۔ وہ حق ہے۔ یہ بات خلاف قیاس ہے کہ جس شخص کو چالیس برس کی عمر تک دوست اور دشمن سب بالاتفاق سچا۔ متدین اور راست باز تسلیم کرتے رہے ہوں وہ دفعتاً بغیر اپنے کسی ذاتی نفع کی توقع کے اور گونا گوں خطرات میں مبتلا ہو جانے کے قوی اندیشہ کے باوجود غلط گوئی اور افترا پر دازی اختیار کرے۔ لہذا اس باب میں ہم پہلے آنحضرت صلعم کے چند ابتدائی حالات درج کر کے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اپنے اور پرانے آپ کی رسالت کی نسبت کیا رائے رکھے تھے۔

احادیث میں مذکور ہے کہ جب آنحضرت صلعم سے دریافت کیا گیا کہ وحی کیوں نازل ہوتی ہے تو آپ نے فرمایا کہ کبھی تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ چہرہ وہ منقطع ہو جاتی ہے اور جو کچھ مجھ سے کہا جاتا ہے اسے یاد رکھتا ہوں۔ اور بھی فرشتہ آدمی کی صورت میں مجھ سے کلام کرتا ہے اور جو کچھ وہ مجھ سے کہتا ہے مجھے یاد ہو جاتا ہے۔

گو وحی کی حقیقت واضح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ مگر یہ سب دیکھتے تھے اور جانتے تھے کہ نزول وحی پیغمبر صاحب پر بہت مشاق



گزرتا تھا۔ رنگت فٹ ہو جاتی تھی۔ اور جسم میں گرانی آجاتی تھی یہاں تک کہ کبھی آپ اونٹنی پر سوار ہیں اور وحی نازل ہوتی تو اونٹنی سے آپ کا بوجھ برداشت نہیں ہو سکتا تھا اور بیٹھ جاتی تھی اور کبھی ایسا ہوا کہ آپ کسی صحابی کے ران پر سر رکھے ہوئے لیٹے ہیں اور وحی نازل ہوتی تو اس صحابی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ران مارے بوجھ کے ٹوٹ جائے گی جسم کی گرانی اور رنگت فٹ ہونے کے علاوہ ایک کیفیت یہ بھی تھی کہ کسی ہی سخت سردی ہو نزول وحی کے وقت آپ پسینے پسینے ہو جاتے تھے نزول وحی کے وقت جو حالت پیغمبر صلعم پر طاری ہوتی تھی اس کو اوقات مختلف میں سیکڑوں صحابیوں نے دیکھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ نزول وحی میں کسی طرح کا شک اور شبہ نہیں کرتے تھے۔ نزول وحی کسی حالت کسی وقت اور کسی مقام کا پابند نہ تھا۔ پیغمبر صلعم وحی نازل ہونے کے وقت الفاظ وحی کا اعادہ فرمانے میں عجلت فرماتے تھے اور کیفیت نزول وحی زائل ہونے پر آپ فوراً کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلوا کر لکھوا دیتے تھے اور اس کے علاوہ اسی وقت الفاظ وحی زباں زد صحابہ ہو جاتے تھے پیغمبر صحابہ کے زمانہ میں کتابت کا رواج ابتدائی حالت میں تھا۔ اور خاص کر عرب میں یوں بھی لکھنے پڑھنے کا دستور بہت ہی کم تھا۔ لہذا وحی کبھی ہرن کی جھلیوں کبھی اونٹ کی ہڈیوں اور کبھی گھجور کے پتوں پر لکھی جاتی۔ اور صحاب

میں سے جن کو زیادہ شوق تھا وہ بطور خود وحی کو جمع کرتے جاتے تھے لیکن بالاستیعاب نہیں بلکہ جس کو جو کچھ بہم پہنچا یا جمع کر لیا اس طرح جماعت صحابہ میں پورا قرآن مجید موجود تھا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ انسان کے حواس ظاہری اور باطنی زیادہ استعمال کرنے سے زیادہ قوی ہو جاتے ہیں۔ اس زمانہ میں چونکہ لوگ پڑھے لکھے نہ تھے قوت حافظہ کو زیادہ کام میں لاتے تھے اس لیے ان کی قوت حافظہ بہت تیز تھی اور چونکہ اہل زبان تھے اور قرآن مجید کی فصاحت اعلیٰ درجہ کی فصاحت تھی قرآن مجید کا جملہ جملہ ضرب اللامثال کے طور پر سب کی زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ سورتوں کے نام اور آیات کی ترتیب یہ سب کچھ خود پیغمبر صاحب ہی اپنی زندگی میں معین فرما گئے تھے جب وحی نازل ہوتی تو کاتبان وحی سے آپ فرما دیا کرتے تھے کہ اس کو فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھ لو۔ آپ خود بھی کلام پاک کے حافظ تھے اور دیگر حفاظ کی ایک جماعت تھی وہ بھی قرآن مجید کو آنحضرت کی بتائی ہوئی ترتیب کے ساتھ تلاوت کیا کرتے تھے۔ آپ کی آخر حیات تک

زید بن ثابت انصاریؓ۔ عبداللہ بن مسعود۔ خلفائے اربعہؓ۔ معاذ بن جبلؓ۔

ابی بن کعب۔ سعد بن ابی وقاصؓ۔ عبداللہ بن ارقمؓ۔ ثابت بن قیسؓ۔

اور اکثر صحابہ صنفہ وغیرہ ایسے حافظ تھے کہ اول سے آخر تک تمام

قرآن مجید بالترتیب ان کو حفظ تھا۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں اس  
 گئے گزرے زمانہ میں بھی مسلمانوں کے ہر شہر اور گاؤں میں بے شمار حافظ  
 مرد عورت بوڑھے جوان اور بچے موجود ہیں جب اس زمانہ میں ان حافظ  
 کی جو قرآن مجید کو سمجھتے بھی نہیں یہ کثرت ہو تو عرب جن کے حافظے بہت  
 قوی تھے ہزار ہا اشعار جاہلیت کے ان کے نوک زبان تھے سیکڑوں  
 خاندانوں کے نسب نامے اور سلسلے ان کی زبان پر تھے بلکہ گھوڑوں اور  
 اونٹوں کے نسب نامے بھی یاد رکھتے تھے اس پر قرآن مجید کی تلاوت  
 سے واقف تھے اس کی فصاحت و بلاغت کو خوب سمجھتے تھے اس کے  
 روح کو جنبش دینے والے مضامین ان میں نشہ پیدا کرتے تھے اور  
 پھر رات دن کی تلاوت موجب ثواب سمجھی جاتی تھی۔ اور سب سے  
 بڑھ کر یہ کہ خود صاحب قرآن ان کے درمیان موجود تھے۔ اور نمازوں  
 میں پڑھا جاتا تھا۔ ان موافق اور موید حالات میں جس قدر حافظ ہوتے  
 گھوڑے تھے۔

آنحضرت کے زمانہ میں قرآن مجید تمام و کمال لکھا جا چکا تھا۔ مگر  
 اس کے تمام اجزا کو ایک جلد میں جمع کرنے کی ضرورت ہنوز محسوس  
 نہیں ہوئی تھی۔ آنحضرت صلعم کی وفات سے کچھ دنوں بعد مسلمہ کذاب کے  
 ساتھ لڑائی میں بہت سے حفاظ نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اس وقت

حفاظتِ قرآن کی ضرورت کا سب سے پہلے احساس ہوا کہ اس کو لکھو کر ایک جلد میں جمع کرایا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ نے قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کیا جس کے یہ معنی ہیں کہ جو کچھ جھپیوں، ہڈیوں، اور پتوں پر لکھا ہوا تھا، اور سینوں میں محفوظ تھا، آپ نے حفاظ کی مدد سے سب کو ایک جگہ بالترتیب لکھوا کر ام المومنین حفصہؓ کے پاس رکھو دیا حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں دور دراز ممالک میں اسلام پہنچ چکا تھا عراق، مصر، شام اور ایران وغیرہ بلاد کے لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے تھے اور ہر جگہ حفاظ نہ پہنچ سکتے تھے اور اختلافات کا اندیشہ تھا اس لیے حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ اس قرآن مجید کی نقلیں کرا کے حفاظ کی تصدیق کے بعد جگہ جگہ بھیج دیں اور متفرق اور منتشر طور پر جو جس کے پاس تھا اس کو سداختلاف کی غرض سے تلف کرا دیا۔ اور جیسا کہ خود قرآن مجید میں اعلان موجود ہے (جس کا ذکر آئندہ آئے گا) اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی حفاظت کا ایسا حکم انتظام فرمایا کہ دنیا میں جس قدر قرآن لکھے گئے اور لکھے جائیں گے ان میں زیرو زبر بلکہ ایک نقطہ کا بھی فرق نہ ہوگا۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو کسی قوم کی کسی کتاب کو اس وقت تک نصیب نہیں ہوتی اور آئندہ ہوگی بھی نہیں۔

صحیح ترتیب قرآن مجید کے متعلق خود قرآن شریف میں بھی مذکور ہے

قوی شہادت موجود ہے۔ جب آنحضرت صلعم پر وحی نازل ہوا کرتی تھی تو آپ اس کے الفاظ دہرانے میں عجلت فرمایا کرتے تھے تاکہ وحی الہی کے تمام الفاظ عاقلہ میں بالترتیب محفوظ ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلا دیا کہ آپ کو عبارت یاد رکھنے کی غرض سے الفاظ دہرانے میں عجلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (یعنی اس کا جمع کر دینا اور پڑھنا دینا ہمارے ذمہ ہے۔ سورہ قیامت پہلا آیت) صاف ظاہر ہے کہ اس آیت میں لفظ جمع میں ترتیب کا مفہوم غالب ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ترتیب کا کام وحی کی صحت بھلی اپنے ذمہ رکھی۔ اس آیت میں سے ترتیب کا مفہوم خارج کر دینے سے یہ ارشاد باری نعوذ باللہ یعنی ہوا جاتا ہے۔ کیونکہ خلاصہ وحی یا وحی کا صرف مطلب یاد رکھنا ایسا مشکل کام نہ تھا جس کے لیے ایسے اہم وعدے کی ضرورت پڑتی نیز اللہ تعالیٰ نے حفاظت قرآن مجید کا صاف اعلان فرمایا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاَنَّا لَآلِهٌ حٰفِظُوْنَہٗ (یعنی بے شک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ سورہ الحجر رکوع ۱) ترتیب بھی کتاب کا جزو اہم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک کی حفاظت کا ایسا مضبوط اور قابل اعتماد انتظام فرما دیا ہے کہ قیامت تک اس میں کسی قسم کی تحریف ترمیم کمی بیشی اور تغیر و تبدل کا اندیشہ نہیں رہا۔

لیکن اگر مرضی الہی کے مطابق کلام الہی کی شیرازہ بندی ہوئی ہوتی اور صرف بے ترتیب کلام کی حفاظت کا وعدہ ہوتا تو آیات کی ترتیب میں مختلف علما کی رائے کے مطابق رد و بدل ہونے سے عیسائیوں کی چار انجیلوں کی طرح کتاب اللہ کی بھی متعہ و صورتیں پیدا ہو جاتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیا عقل سلیم اس بات کو تسلیم کرتی ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کی خود حفاظت کرنے کا ایسا صاف وعدہ فرمانے کے باوجود اس کلام کی ترتیب کو ایک نزعی مسئلہ بنانے کے لیے تمیز بشری پر چھوڑ دیتا جس کا مجاہد کی موجودہ ترتیب کے علاوہ اور کوئی ترتیب دنیا سے اسلام میں مسئلہ نہیں ہو۔ اور اس ترتیب سے کسی اور مختلف ترتیب کا دنیا میں کوئی حافظ نہ پہلے گزرا ہو نہ اس وقت موجود ہو۔ تو ظاہر ہو کہ موجودہ ترتیب ہی "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ" اور "اِنَّا لَاحْفَظُوْنَ" کے صریح وعدوں کی مصداق ہے۔ اگر کسی اور غیر معروف ترتیب کی صحت کا کوئی شخص مدعی ہو تو وہ ترتیب مسلمانوں میں کہیں مروج نہیں ہو۔ نہ اس ترتیب کی حفاظت کے کسی انتظام و اہتمام کا پتہ چلتا ہو حالانکہ حفاظت قرآن مجید کی حفاظت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔

نبوت سے قبل آنحضرتؐ آبادی سے دو تین میل دور بہار پر تشریف لے جاتے اور ایک کھود میں جو غار حرا کے نام سے مشہور ہے کئی کئی دن تک عبادت اور مراقبہ میں مشغول رہتے تھے۔ ایک روز غار حرا میں حسب معمول

آپ محمد عبادت تھے کہ فرشتہ پہلی بار وحی لیکر آیا۔ اور سورہ "علق" (اقراء) باسم سر پاتا الذی خلقت کی ابتدائی آیتیں نازل ہوئیں۔ اس فرشتہ نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا رسول منتخب کیا ہے۔ اس نزول وحی کے بعد آپ پریشان خاطر اور خوف زدہ اپنے گھر تشریف لائے اور اپنی بیوی خدیجہؓ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت خدیجہؓ نے جو مکہ کی ایک آسودہ حال دانشمند خاتون تھیں اور نزول وحی سے پیشتر ستر برس کے رات دن کے تجربہ سے آپ کی صفات، دیانت و امانت استباری حق دوستی اور حق پسندی اور رعایت درجہ کی عقل و فہم سے بخوبی واقف تھیں آپ کی بات سن کر فرمایا: "یا حضرت آپ تو نیکی کرتے ہیں۔ بیکسوں اور مسکینوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ غریبوں اور محتاجوں کو صدقہ دیتے ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کرتے ہیں۔ عزیزوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ کسی کا دل نہیں دکھاتے۔ مقروضوں کا ہارا اٹھاتے ہیں۔ حق کی حمایت کرتے ہیں اور مہیبتوں میں لوگوں کے کام آتے ہیں۔ ایسے نیک بندے کو اللہ تعالیٰ کبھی غمگین نہ کرے گا!"

آنحضرت صلعم کی تبلیغ اسلام کی سب سے پہلی اور ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے اپنے گھر سے تبلیغ شروع کی۔ اور سب سے پہلے آپ کی بیوی حضرت خدیجہ الکبریٰؓ آپ پر ایمان لائیں۔ ان کے بعد حضرت علی کرم اللہ

~~68634~~

86134

وجہ نے جو آپ کے چچا زاد بھائی تھے اور جن کی عمر اس وقت آٹھ سال کی  
 تھی اسلام قبول کیا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما مشرف باسلام ہوئے۔ یہ  
 اپنی قوم یعنی قبائل قریش میں نہایت ہر و عزیز اور صاحب ثروت و  
 دولت تھے۔ چوتھے ایمان لانے والے حضرت زید بن حارثہ تھے جن کا عرف  
 زید بن محمد تھا۔ یہ پہلے حضرت خدیجہؓ کے غلام تھے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو  
 ہبہ کر دیا تھا۔ اور آپ نے ان کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ حضرت ابو بکرؓ ایمان لانے  
 کے بعد اپنے دوستوں کو بھی اسلام کی تلقین کرنے لگے۔ چنانچہ ان کی کوشش  
 سے حضرت عثمان بن عفان، زبیر بن عوام، عبدالرحمن بن عوف  
 سعد بن ابی وقاص، طلحہ بن عبید اللہ، ابو عبیدہ بن جراح، ابو سلمہ  
 رقم مخزومی، عبیدہ بن حارث، اور سعید بن زید نے اسلام قبول کیا  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے ساتھ رقم مخزومی کے گھر میں جمع ہوتے تھے اور  
 وہاں قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے۔ سنتے ہیں کہ یہ گھر مکہ میں اب تک باقی ہے  
 مگر افسوس ہے کہ اس کی تاریخی عظمت کے لحاظ سے اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں اور عزیز ترین دوستوں کا سب سے  
 پہلے آپ پر ایمان لانا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ کوئی شخص دوسروں سے  
 اپنی بات تب ہی منوا سکتا ہے جبکہ وہ خود سچا اور معتبر ہو۔ اور جس کی صداقت  
 اور راست بازی کے صرف اعیار ہی معترف نہ ہوں بلکہ اس کے گھر کے



لوگ اور اُس کے قریب رشتہ دار اور دوست بھی اُس کو مخلص اور سچا سمجھتے ہوں۔ کیونکہ گھر والوں کو ذرا ذرا سی باتوں کی خبر رہتی ہے۔ اُن کے سامنے کسی قسم کی مکاری اور عیاری نہیں چل سکتی۔ غیر لوگ تو ممکن ہو کہ اُس کی چلنی چڑھی اور جھوٹی سچی باتیں مان لیں۔ مگر گھر کے بھید پوں کو بہکانا محال ہے۔ آپ کی بیوی آپ کی بعثت سے قبل پندرہ سال آپ کی اُمت میں رہ چکی تھیں۔ لہذا آپ کی عادات و اطوار سے بخوبی واقف تھیں۔ اسی طرح آپ کے رشتہ دار اور آپ کے دوست احباب آپ کی سیرت اور خصال سے بخوبی واقف تھے۔ اور آپ کے ذرا ذرا حالات سے باخبر تھے اس قدر سی صفات انسان کی امانت اور دیانت نے ہم وطنوں کی طرف سے اُس کے لئے اِیمان کا لقب حاصل کیا تھا۔ اس کی راست گوئی اور راست بازی دوست و دشمن سب کو یکساں تسلیم تھی۔ جب آنحضرت نے اسلام پیش کیا تو یہ سب لوگ بلا پس و پیش آپ پر ایمان لے آئے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ کھلا ہوا تاریخی واقعہ ہے جو سب کو تسلیم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت اپنے گھر کے اندر مکر و فریب کا ایسا گہرا حال سمجھاتے کہ پندرہ برس تک آپ کی بیوی اور قریب کے رشتہ داروں کو آپ کی عیاری کا پتہ نہ چلتا ایک آدمی چند لوگوں کو کچھ عرصہ کے لئے دھوکا دے سکتا ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص تعداد کثیر کو ہمیشہ دھوکے میں مبتلا رکھ سکے۔ اگر حضرت پر

ایمان لانے والوں کو آپ کی صدق نیت اور آپ کے تبلیغی مواعظ و حکام کے منجانب اللہ ہونے کا یقین نہ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ سمجھدار عورتیں اور اعلیٰ درجہ کے ذی وقعت اور دانشمند اشخاص جن کی لیاقتیں سلطنت جہویہ اسلامی کی سرداری اور سپہ سالاری میں اپنے اپنے موقعہ پر آفتاب نیمروز کی طرح چمک کر ثابت ہوئیں۔ دنیا طلبی اور مکر و فریب اور فقدان ایمان۔ اور نقصان اور سفاقت عقل کی کوئی علامت ذرا بھی آپ میں پائے اور فوراً آپ کی بات رو نہ کر دیتے۔ اور کیا باپ بیٹوں سے اور مائیں بیٹوں سے اور بہنیں بہنوں سے اور بھائی بھائیوں سے اس طرح جدا ہونا گوارا کر سکتے تھے جس طرح اسلام اور بانی اسلام کی محبت سے اپنے آبائی اور عزیزند سب کو چھوڑ کر جدا ہو گئے۔ اور کیا مال و مال اور عزیز و اقارب اور پیارے وطن کی آفت پر خاک ڈال کر غریب الوطنی کی زندگی اختیار کرنا پسند کرتے۔ پشکیں بندھے ہوئے بھوکے پیاسے مکہ کی نہایت گرم اور تیز دھوپ میں سینہ پر بھاری پتھر رکھ کر چلتی ہوئی پتھریلی زمین پر ڈال دیئے جانے کو عیش و آرام کی زندگی پر ترجیح دیتے۔ اور برسوں تک اپنی قوم سے بالکل بے تعلق اور الگ قیدیوں کی سی زندگی بسر کرنے اور طرح طرح کی تکلیفیں اور مصیبتیں سہنے اور اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالنے کو مرغوب سمجھتے ہرگز نہیں۔ چنانچہ سرو لیم میو رجو ایک بہت بڑے عالم اور محقق انگریز لکھتے

اور ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۲ء تک ہمارے صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر رہ چکے ہیں۔ اور جنہوں نے نہایت تحقیق و تفتیش کے ساتھ آنحضرت صلعم کی سوانح عمری (لائف آف محمد) چار جلدوں میں لکھ کر شایع کی وہ اپنی اسی کتاب میں فرماتے ہیں کہ "حضرت محمد کے اخلاص اور صداقت کا یہ بے راز بر دست ثبوت ہے کہ ان کا

مذہب سب سے پہلے قبول کرنے والے ان کے دلی دوست اور ان کے گھرانے کے لوگ تھے۔ یہ لوگ سب کے سب ضرور ان کے روزمرہ کے حالات اور ان کی گھریلو زندگی سے بخوبی واقف ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ دوسروں کو دھوکا اور فریب دینے کی غرض سے مکاری اور عیاری سے کام لیتے ہیں تو ان کے ان احوال میں جو محض دوسروں کے سنانے کے لیے وہ باہر مجمع عام میں کہہ کرتے ہیں اور گھر کی چار دیواری کے اندر ان کے اعمال میں عموماً ہمیشہ فرق اور اختلاف ہوا کرتا ہے۔ اگر محمد کی غرض و غایت فریب اور دھوکے سے کام لینا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ ان کے دوست اور احباب اور ان کے قریبی رشتہ داروں کو جو ان پر سب سے پہلے ایمان لائے ان کی مکاری اور عیاری کا پتہ نہ چل جاتا۔"

مسٹر گاڈ فرے مکنس انگلستان کے ایک آسودہ حال مشہور عالم و فاضل اور محقق عیسائی ہیں جنہوں نے باوجود عیسائی مذہب رکھنے کے ازراہ

منصف مزاجی اب سے سو برس پیشتر ۱۸۲۹ء میں ایک کتاب "اپالوجی فار محمد" صرف اس غرض سے تصنیف کی گئی کہ عیسائی عالموں اور یورپوں نے ازراہ تعصب اسلام اور بانی اسلام کے خلاف جو ہمتیں تراشی ہیں اور تمام ممالک یورپ میں اسلام اور پیغمبر عرب کی طرف سے بدظنی اور نفرت پھیلانے کی غرض سے جن جن دروغ بافیوں اور افترا پروازیوں سے کام لیا، ان کا پر وہ فاش کریں تاکہ دین اسلام کی حقیقت سے آگاہ ہو کر اہل یورپ اور خصوصاً اہل انگلستان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کی ساکھ و اداری کے جذبات پیدا ہوں۔ بالخصوص اس لئے کہ انگلستان سے مسلمانوں کی ایک تعداد کثیر کا تعلق ہے اور ان کی فلاح و بہبود سے انگلستان کو خاص دلچسپی ہے۔ آپ اپنی کتاب "اپالوجی فار محمد" کے فقرہ ۱۷ میں فرماتے ہیں کہ "اگر حضرت محمدؐ اپنی نبوت کے دعوے میں سچے تھے تو ان کی بیوی خدیجہؓ کا ان پر سب سے پہلے ایمان لانا کچھ بھی تعجب کی بات نہ تھی لیکن اگر محمدؐ فریبی اور مکار تھے تو خدیجہؓ سے عقد کے بعد اظہار نبوت کے دن تک اپنی بیوی کو پندرہ سال مسلسل دھوکے میں رکھنے کے لئے انھوں نے حد درجہ کی عیاری سے کام لیا ہوگا۔ کیونکہ یہ سب کو بالاتفاق تسلیم ہے کہ خدیجہؓ ان کے مذہب پر صدق دل سے ایمان لائیں۔ اور ان کی سچی معتقد تھیں۔ نہ وہ

منافق تھیں۔ ان کی نسبت کسی نے آج تک یہ بڑھنی کی ہو  
 کہ وہ اپنے شوہر کے مکر و فریب کی کارروائیوں میں شریک یا  
 ہمراز تھیں۔ خدیجہ کے بعد ان کے چچا زاد بھائی علیؓ ابن ابوطالب  
 ایمان لائے اور پھر ابو بکرؓ نے دین اسلام قبول کیا۔ چونکہ ابو بکرؓ  
 سب سے زیادہ دولت مند لوگوں میں سے تھے اور ہم ہشتموں میں  
 بڑے عقلمند اور تجربہ کار سمجھے جاتے تھے۔ آپ کے ایمان لانے سے  
 محمدؐ کو بہت کچھ مدد ملی۔ اور ان کے مذہب کی شہرت ہو گئی  
 اور آپ کی مثال سے متاثر ہو کر اور کئی شخصیں ایمان لائے  
 جن میں عثمان ابن عفانؓ، زبیر بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ  
 عبدالرحمن بن عوفؓ رضی اللہ عنہم اور ابو عبیدہ بن جراحؓ بھی شامل  
 تھے جو کہ بعد میں اسلامی افواج کے سپہ سالار بنے۔ اور جن کی  
 بدولت اسلام کو بڑی بڑی فتوحات میسر ہوئیں۔

پیغمبر اسلام کی تبلیغ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ آپ پر جو لوگ سب سے  
 پہلے ایمان لائے وہ بڑے بڑے قابل و فاضل اہل الرائے اور مکہ کے  
 چیدہ افراد تھے جنہوں نے آپ کی وفات کے بعد زبردست حکومت اور  
 سپہ سالاریاں کیں اور حکومت کا بہت عمدہ انتظام کیا۔ اور ساری دنیا  
 پر اپنے تدبیر اور اپنے عدل و انصاف کا سکہ بٹھا دیا۔ چنانچہ مسٹر گاڈ فرائیس

اپنی کتاب کے فقرہ نمبر ۱ میں تحریر فرماتے ہیں کہ

باوجودیکہ محمدؐ اور عیسیٰؑ کی ابتدائی سوانح عمری میں ایسے حالات ہیں جن میں عجیب مشابہت پائی جاتی ہے۔ لیکن بہت سے ائمہ ایسے ہیں جن میں سراسر اختلاف ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰؑ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے آپ کے بارہ حواریوں کی نسبت تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ ناخواندہ۔ بے سمجھ اور بہت ہی کم حیثیت لوگ تھے۔ اس کے برعکس محمدؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ان کے غلام زید کے سوا سب کے سب معزز طبقہ کے لوگ تھے۔ اور اپنے اپنے وقت پر بحیثیت خلیفہ اور سپہ سالار افواج کے ان لوگوں نے اپنے شاندار کارناموں سے آئندہ زمانہ میں ثابت کر دیا کہ یہ سب کے سب نہایت قابل اور اعلیٰ درجہ کے دل و دماغ رکھنے والے لوگ تھے۔ ایسے سیدھے سادے لوگ نہ تھے جو آسانی سے کسی کے دم فریب میں گھنس جاتے۔ حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں کی بے کسی اور کم حیثیتی کو بعض عیسائی علماء دین عیسوی کی خوبی سمجھتے ہیں۔ اور اس کو دین عیسوی کی آئندہ کامیابی کا سبب قرار دیتے ہیں مگر مجھ سے کوئی سچ پوچھے تو مجھے اس حالت میں خوشی ہوتی اگر

حضرت عیسیٰ پر سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں لاکھ  
 اور بیوٹن جیسی حیثیت کے فلاسفا اور حکیم ہوتے،  
 (فقہہ ۱۹) ابتدائی چند سالوں میں اپنے دین کی تبلیغ میں محمد کو کچھ زیادہ  
 کامیابی نہیں ہوئی۔ مخالفوں کی جانب سے اُن کی جو توہین اور  
 تحقیر کی جاتی تھی اور اُن کے ساتھ تمسخر کیا جاتا تھا اور طرح طرح  
 کی دھمکیاں اُن کو دی جاتی تھیں اُن کی اُنھوں نے مطلق  
 پروا نہیں کی اور بلا خوف و خطر اپنے مذہب کی تبلیغ میں مصروف  
 رہے۔ یہاں تک کہ چوتھے سال کے ختم پر عیسائی مورخوں کی  
 شہادت کے مطابق صرف ۹ شخص اُن پر ایمان لائے تھے جنہیں  
 ایک عمرین خطاب بھی شامل ہیں جو اہل مکہ میں نہایت سربراہ اور  
 شخص تھے۔ اور جو اپنی غیر معمولی قابلیتوں کی بدولت آگے چل کر  
 خلیفہ اسلام اور قریب قریب ساری ایشیا پر حکمراں بنے،  
 (فقہہ ۲۶) باوجود پادری صاحبان اور عیسائی مصنفین کی بے شمار غلط بیانیوں  
 اور دروغ بافیوں کے ہجرت کے وقت تک محمد صاحب کی زندگی  
 اور اُن کے اخلاق اور اُن کا چال چلن نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کا  
 تسلیم کیا جاتا ہے۔ سوائے اُن کے آئندہ پر فریب منصوبوں کے کوئی  
 عیسائی مورخ ایک الزام بھی اُن پر عائد نہیں کر سکا ہے۔

(فقہ ۴۲) ”تمام عیسائی موسخ بالاتفاق تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدا سے لیکر وسط  
 عمر تک محمدؐ کی سیرت اور چال چلن بہت اچھا رہا جس کے خلاف  
 کچھ نہیں کہا جاسکتا تو پھر بھلا یہ کیوں کر مان لیا جاسے کہ پچیس سال  
 کی عمر سے لیکر چالیس سال کی عمر تک سب کچھ فریب تھا پچیس برس  
 کی عمر تک وہ نہایت متدین اور جفاکش رہے۔ ان کی دیانت  
 پر کسی کو شک و شبہ نہ تھا اور اس دیانت اور جفاکشی کے صلہ میں ان کو  
 دولت و امارت میسر ہوئی تو کیا اس خوش نصیبی اور آسودگی نے  
 اس متدین اور استبار شخص کو بیکار اور دغا باز بنا دیا اس  
 حیرت انگیز قلب ماہیت کے دو مقصد قرار دیئے جاسکتے ہیں (۱) دنیا پر  
 حکمرانی یا (۲) عورتوں کے ساتھ عیش و نفس پرستی“

”اگر محمدؐ کو امارت اور حکومت مقصود تھی تو اس کی سب سے پہلی تدبیر  
 یہ تھی کہ وہ کعبہ کا متولی بننے کی کوشش کرتے خصوصاً اس لئے کہ  
 کعبہ کی تولیت ان کے خاندان میں علی آتی تھی۔ اور یہ کعبہ کی تولیت  
 تمام ملک عرب میں اعلیٰ درجہ کا رتبہ اور منصب سمجھا جاتا تھا۔ ہا عیش  
 اور نفس پرستی انھوں نے سب سے پہلے اپنی شادی ایک بیوہ عورت  
 (خدیجہؓ) سے کی جو عمر میں ان سے پندرہ برس بڑی تھی۔ اور خود  
 ان کی عمر اس وقت پچیس برس کی تھی جو عین عروج شباب کا زمانہ



تھا۔ اور اگرچہ ملکی رسم کے مطابق ان کو کسی بیویاں رکھنے کی اجازت تھی مگر انھوں نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مرنے تک کوئی دوسری شادی نہیں کی۔ اور اس ایک بیوی کے ساتھ حد درجہ کی وفاداری اخلاص اور محبت کا برتاؤ رہا۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے وقت محمدؐ کی عمر پچاس سے زیادہ تھی۔ یعنی شباب ختم ہو چکا تھا۔ کیا ایسا شخص جو صورت اور سیرت میں یکتا مانا جاتا ہو ایک چالیس سالہ بیوہ عورت کے ساتھ اس کی محبت کی نسبت اس کے سوا اور کیا خیال کیا جاسکتا ہو کہ چونکہ ضرورت کے وقت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سب سے زیادہ حقیقی دوست ثابت ہوئی لہذا جذبات تشکر اور احسانمندی نے محبت کی صورت اختیار کر لی۔ اور تشکر گزاری اور احسانمندی صفت

محمود ہو۔

آگے چل کر مسٹر گاڈ فرے مگنس نے اپنی کتاب کے فقہ ۷۱۸ء میں گلہستان کے مشہور و معروف مؤرخ ایڈورڈ گین مصنف تاریخ زوال سلطنت رومۃ الکبریٰ

کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

”پہلے چار خلیفوں کے اطوار یکساں مخلصانہ اور اعلیٰ درجہ کے تھے ان کی سرگرمی و سوزی اور اخلاص پر مبنی تھی ثروت اور اختیار پا کر بھی انھوں نے اپنی عمریں ادائے فریض اخلاقی و مذہبی میں صرف کیں

یہی لوگ محمد کے ابتدائی مشرک تھے جو پیشتر اس کے کہ اس نے اقتدا  
 حاصل کیا یعنی تلوار بیکڑی اس کے جانب ارہو گئے۔ اور ایسے وقت  
 میں کہ وہ ہدف آزار تھا اور جان بچا کر اپنے وطن سے چلا گیا۔ ان  
 لوگوں کے سب سے پہلے تبدیل مذہب کرنے سے ان کی سچائی  
 ثابت ہوتی ہے۔ اور پھر دنیا کے فتح کرنے سے ان کی قابلیتوں کی  
 فوقیت ثابت ہوتی ہے۔

اسی سلسلہ میں مسٹر گاڈ فرے گنٹس اپنی کتاب کے اگلے فقرہ میں تحریر کرتے  
 ہیں کہ ”اس صورت میں کون یقین کر سکتا ہے کہ ایسے شخصوں نے طرح طرح کی  
 ایذا میں نہیں۔ اور اپنے ملک سے جلا وطنی گوارا کی اور نہایت سرگرمی  
 سے اس کے پیرو ہوئے۔ اور یہ سب امور ایک ایسے شخص کے لئے  
 ہوں جس میں ہر طرح کی بدکاریاں اور بُرائیاں ہوں۔ اور ایک ایسے  
 سلسلہ فریب و غیاری کی خاطر ہوں جو ان ایمان لانے والوں کے  
 خیالات رجحانات اور دیرینہ مذہبی عقاید کے سراسر منافی ہو۔ ایسا  
 ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔“

(فقہہ ۱۲۲) عیسائی اس بات کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد کے اصولوں نے اس کے  
 پیروں میں جس درجہ کا نشہ دینی پیدا کیا تھا اس کو عیسے کے ابتدائی  
 پیروں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور اس کا مذہب اس تیزی کے

ساتھ پھیلا جس کی نظیر دین عیسوی میں نہیں ملتی چنانچہ نصف  
 صدی سے کم میں اسلام بہت سی عالیشان اور سرسبز سلطنتوں پر  
 غالب آگیا جب عیسے کو سولی دی گئی تو اس کے پیرو بھاگ گئے۔  
 برعکس اس کے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد بٹھے رہے اور اس  
 کی حفاظت کی خاطر اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر اس کو کل دشمنوں پر  
 غالب کر دیا۔

اینسا ایکلو پیڈیا برٹانیکا کا فاضل مقالہ نگار محمد اور اس کا مذہب کے عنوان  
 کے تحت میں لکھتا ہوں کہ

”جو یقین کہ اس نے (آنحضرت صلعم نے) اپنے قریب کے لوگوں یعنی خدیجہؓ  
 ابو بکرؓ اور عمرؓ کے دل میں پیدا کیا اور جو ہر طرح کی تکلیف اور ذلت  
 اس نے بارہ برس تک جھیلی اور نہایت جو انمردی سے ہر قسم کی دود  
 اور سرداری قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کا حامل ہونا سرف  
 اس شرط پر موقوف تھا کہ وہ اپنی کوشش سے باز آئے۔  
 نیز اس سادہ مزاجی اور سادہ طرز معاشرت کا خیال کر کے جو آخری  
 وقت تک اس میں قائم رہی ہم پر پڑو۔ والیٹر اور مرآتی کی  
 رائے قبول نہیں کر سکتے بلکہ مہلکے کارسن۔ کارلائل اور اونگ  
 اور دیگر محققین سے متفق ہیں کہ عام طور پر محمدؐ کی صداقت کو تسلیم کریں اور

اس بات کو قبول کریں کہ اس کو اپنے اوپر بھروسہ تھا۔ اور وہ اپنی

رسالت کو برحق سمجھتا تھا۔

مسٹر ٹامس کارل لائل انگلستان کے ایک نہایت مشہور مصنف ہیں جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے تمام یورپ میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔ وہ اپنی شہرہ آفاق کتاب "ہیروڈوٹس ڈی ہیرودورسٹس" (لکچر دوم صفحہ ۴۳) میں جو پہلی بار ۱۸۴۷ء میں شایع ہوئی کھلی تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہم محمدؐ کی نسبت ہرگز یہ خیال نہیں کر سکتے کہ وہ صرف ایک

شعبہ باز اور تہی باطن شخص تھا۔ اور نہ ہم اس کو ایک حقیر جاہ طلب

اور دیدہ و دانستہ منصوبے گا نھٹنے والا شخص کہہ سکتے ہیں جو سخت اور

کرت پیمانہ اس نے دنیا کو دیا وہ ہر حال میں ایک سچا اور حقیقی

پیغام تھا۔ اس کا ماحذ وہی ہستی تھی جس کی تھا کسی نے بھی نہیں پائی

اس شخص کے نہ اقوال ہی جھوٹے تھے نہ اعمال۔ اور نہ وہ عالی از حد

تھے۔ نہ کسی کی نقل و تقلید تھے۔ حیات ابدی کا ایک نورانی وجود تھا۔

جو قدرت کے وسیع سینہ میں سے دنیا کو منور کرنے نکلا تھا اور بلاشبہ

اس کے لیے امر ربانی یوں ہی تھا۔"

مسٹر ٹامس کارل لائل کی مذکورہ بالا کتاب "ہیروڈوٹس ڈی ہیرودورسٹس" کی عبارت ذیل سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "خطبات اچریہ"

## کے دیباچہ میں نقل کی ہو کہ

”ہم لوگوں (یعنی عیسائیوں) میں جو یہ بات مشہور ہو کہ محمد ایک پرن اور  
 فطرتی شخص اور گویا جھوٹ کے ادوار تھے اور ان کا مذہب دیوانگی اور  
 خام خیالی کا ایک تو وہ ہے۔ اب یہ سب باتیں لوگوں کے نزدیک  
 غلط ٹھہرتی جاتی ہیں۔ جو جھوٹ باتیں سرگرم مذہبی لوگوں (یعنی  
 عیسائیوں) نے اس انسان (یعنی محمد) کی نسبت قائم کی ہیں  
 اب وہ الزام قطعاً ہماری رو سیاہی کا باعث ہیں۔ چنانچہ یہ ایک  
 روایت مشہور ہو کہ پوکاک صاحب نے جب گرویس صاحب سے  
 پوچھا کہ یہ قصہ جو تم نے لکھا ہے کہ محمد نے ایک کبوتر کو تعلیم کیا تھا کہ وہ  
 ان کے کان سے میل نکالا کرتا تھا اور مشہور کیا تھا کہ وہ فرشتہ  
 ہے جو ان کے پاس وحی لاتا ہے تو اس قصہ کی کیا سند ہے۔ تو انھوں  
 نے جواب دیا کہ اس قصہ کی کوئی سند اور کچھ ثبوت نہیں ہے حقیقت  
 یہ ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ایسے ایسے قصوں کو بالکل ترک  
 کیا جائے۔ جو جو باتیں اس انسان (محمد) نے اپنی زبان سے نکالیں  
 بارہ سو برس سے اٹھارہ کروڑ آدمیوں کے لیے بمنزلہ ہدایت کے قائم  
 ہیں۔ ان اٹھارہ کروڑ آدمیوں کو کبھی اسی طرح خدا نے پیدا کیا ہے جس طرح  
 ہم کو پیدا کیا۔ اس وقت جتنے آدمی محمد کے کلام پر اعتقاد رکھتے ہیں

اُس سے بڑھکر اور کسی کے کلام پر اس زمانہ کے لوگ یقین نہیں رکھتے  
پھر کیا ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جس کلام پر خدائے قادر مطلق کی  
اس قدر مخلوق زندگی بسر کر گئی اور اسی پر مر گئی۔ کیا وہ ایسا جھوٹا  
کھیل ہو جیسا کہ ایک بازگیر کا ہونا ہی اس موقع پر سرسید احمد خاں  
صاحب مرحوم نے حاشیہ پر ایک نوٹ لکھا ہے جو آخر میں نقل کر دیا گیا  
ہے۔ (مولف) میں اپنے نزدیک ہرگز ایسا خیال نہیں کرتا میں اور  
بہت سی باتوں کا یقین کر سکتا ہوں مگر اس بات کا یقین نہیں سکتا  
اگر جھوٹی اور فریب کی باتیں دنیا میں اس قدر طاقتور ہوں اور  
رواج پکڑ جائیں اور مستلم ٹھہر جائیں تو پھر اس دنیا کی نسبت کوئی  
کیا خیال کرے گا۔ اس قسم کے خیالات جو بہت پھیلے ہوئے ہیں  
بہت ہی افسوس کے قابل ہیں۔ اگر ہم کو خدا کی سچی مخلوقات کا  
علم کچھ حاصل کرنا منظور ہو تو ہم کو ایسی باتوں پر ہرگز یقین نہ کرنا  
چاہیے۔ یہ باتیں ایسے زمانوں میں پھیلی تھیں جبکہ شکوک اور  
بے اعتباری کا دور دورہ تھا روحانیت اور اخلاق مفلوج ہو چکے  
تھے۔ میرے نزدیک اس خیال سے کہ ایک جھوٹے آدمی نے ایک  
مذہب قائم کیا اور کوئی زیادہ بد اور ناپاک خیال دنیا میں  
نہیں پھیلا۔ جہلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک جھوٹا آدمی جو چو نہ

ایسٹ اور سالہ کی خصوصیات پر اعتقاد نہ رکھتا ہو اور پختہ مکان  
 بنا لے۔ وہ پختہ مکان کا ہے کو ہوگا بلکہ خاک کا ایک ڈبھیر ہوگا  
 بارہ سو برس تک اس کو کب قیام ہو سکتا ہے۔ اور اٹھارہ کروڑ  
 آدمی اس میں کیسے رہ سکتے ہیں۔ بلکہ اب تک وہ مکان کبھی کاسر کے  
 بل گر پڑا ہوتا۔ ضرور ہے کہ آدمی اپنے طریقوں کو قانون قدرت  
 کے مطابق کرے اور قدرت کے اسباب کی حقیقت کو سمجھے اور  
 اس پر عمل کرے ورنہ قدرت سے اس کو یہ جواب ملے گا کہ نہیں  
 یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ عیاری عیاری ہی ہی اور صداقت  
 صداقت ہی ہی۔ افسوس ہے کہ بعض شخص مثل کاگ رسترو اور  
 اس جیسے بہت سے دنیا کے سربراہ اور وہ لوگ چند روز کے لیے  
 اپنی عیاری سے کامیاب ہو جاتے ہیں مگر ان کی کامیابی ایک  
 جعلی ہندوی کی مانند ہوتی ہے جس کو وہ اپنے نالائق ہاتھوں سے  
 جاری کرتے ہیں اور خود الگ تھلگ رہتے ہیں مگر اوروں کو  
 اس کے سبب سے نقصان پہنچاتے ہیں مگر قدرت آگ کے شعلوں  
 اور فرانسسی ہنگاموں اور اسی قسم کی غضبناک صورتوں میں ظاہر

۱۰ کاگ رسترو سستی کا رہنے والا ایک عیار شخص تھا جو اپنے آپ کو صاحبِ کامت بنا کر لوگوں  
 سے روپیہ ٹھکا کرتا تھا۔ آخر گرفتار ہو کر قید خانہ میں مر گیا (مولف)

ہو کر یہ صداقت نہایت غضب اور قہر کے ساتھ دنیا پر ظاہر کر دیتی ہے  
کہ حلی ہندو یاں جعلی ہی ہیں۔ غرض اس انسان اعظم (محمد) کی نسبت  
ہرگز یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سچے نہ تھے۔“

سر سید احمد خاں صاحب مرحوم کا نوٹ جس کا حوالہ عبارت مندرجہ بالا  
میں دیا گیا ہے حسب ذیل ہے۔

”میں اس قدر اور زیادہ کرنا چاہتا ہوں کہ کروڑوں آدمی اس وقت  
بھی اسی کلام پر مستحکم اعتقاد سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور جن  
ملکوں میں اسلامی سلطنت کبھی نہیں گئی ان ملکوں کے لوگوں نے بھی ان کی  
باتیں سن کر ان کو قبول کر لیا۔ اور اب بھی کہ اس کے بانی کو دیکھنا  
گئے ہوئے بارہ سو برس گزر گئے ہر ایک ملک میں اور ان ملکوں میں  
بھی جہاں اسلامی سلطنت نہیں ہے ہزاروں نئے لوگ اس پر بغیر  
کسی لالچ اور دھوکے کے اور بغیر کسی تدبیر کرنے والوں کی تدبیر و  
حکمت کے ایمان لاتے جاتے ہیں اور اسلام قبول کرتے ہیں۔ تو کیا  
وہ ایسا جھوٹا کھیل ہے جیسا کہ ایک بازی گر کا ہوتا ہے۔ نہیں بلکہ  
اس کے سچ ہونے کا ہر ایک کے دل پر یقین ہوتا ہے۔“



جس قدر شہادتیں اوپر مذکور ہوئیں ان کی اہمیت کا دار و مدار شہادت دینے والوں کی فضیلت علمی یا ان کی زبردست اور بلند پایہ شخصیتوں پر نہیں ہو بلکہ ان راؤں اور شہادتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مشہور و معروف تاریخی واقعات اور ایسی مضبوط بدیہی عقلی دلائل پر مبنی ہیں کہ ان کی صداقت کا کوئی معمولی سمجھ والا انسان انکار نہیں کر سکتا یہ کھلا ہوا تاریخی واقعہ ہے کہ جس وقت آنحضرت صلعم نے آوازہ نبوت بلند کیا تو اس آواز کی تائید کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ عرب کا ذرہ ذرہ اس صدائے حق کا دشمن تھا۔ آپ پشت پائشت کی جو کردہ عادات کے ترک کی دعوت دیتے تھے۔ موروثی مذہب جو لوگوں کی رگ و پی میں سرایت کیے ہوئے تھا آپ اس کی مذمت کرتے تھے جن بتوں اور دیوتاؤں کے رعب و ہیبت سے وہ کانپتے تھے آپ ان کو منہدم کرنے کا حکم دیتے تھے۔ سرقہ، ڈاکہ، لوٹ مار، قتل و خونریزی، کینہ و عداوت، سود و قمار، بدکاری، شراب، غرض وہ تمام افعال جو عرب کے خصایص بن گئے تھے ان کا قلع قمع کرنا چاہتے تھے۔ علاوہ بریں آپ کے دست مبارک میں کوئی ظاہری مادی طاقت نہ تھی۔ دولت و خزانہ نہ تھا۔ اس دعوت کو قبول کرنے والوں کے لئے بجز بھائی اور بلاؤں کے آپ کے پاس کوئی ظاہری قابل معاوضہ چیز نہ تھی۔ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام کا نام لینے کے ساتھ وہ اپنے گھر سے

بیگانہ اپنی جائداد سے محروم اپنے خاندان سے نا آشنا اپنے وطن سے  
 ہجور اور اکابر شہر اور روسا و قریش میں رسوا اور بدنام اور ہرم کی  
 مصیبتوں کا ہدف اور نشانہ بن جائے گا۔ غریب مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ  
 بے رحمیاں اور سفاکیاں کی جا رہی تھیں وہ سب کے سامنے تھیں۔  
 یا ایہ ہمہ ایک خلقت تھی کہ آستانہ محمدی کی تلاش میں چلی آتی تھی۔  
 عرب کے قبائل دور دور سے چھپ چھپ کر پہنچتے تھے اور بیعت کر کے  
 واپس جاتے تھے اور آخر وہ لوگ بھی جو سا لہا سال تک آنحضرت صلعم  
 کے سخت دشمن تھے۔ اسلام کے شدید مخالف اور غزوات بدر و احد  
 اور احراب و خندق کے بانی تھے وہ بھی ایک روز سر اطاعت  
 جھکانے پر مجبور ہو گئے۔ آخر اس کے کیا اسباب تھے۔ اور کیونکر ان کو  
 محمد رسول صلعم کی رسالت و صداقت کا یقین آیا۔ عیسائیوں کی طرح  
 یہ کہنا آسان ہے کہ محمد نے لڑکر لوگوں کو مطیع بنا لیا لیکن سوال یہ ہے کہ یہ  
 ہزاروں جاں نثار لڑنے والے کہاں سے اور کیونکر پیدا ہو گئے ان کو کس  
 نے لڑکر مطیع بنایا۔

اس اپنے اور پر اے کے غمخوار کی دعوت صرف یہ تھی کہ لوگو  
 لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ کہو تو نجات پاؤ گے۔ اس دعوت سے باز رکھنے میں  
 روسا و قریش جب ہرم کی تدبیروں سے تھک گئے تو انھوں نے آپ کے

سامنے حکومت کا تخت زرو جو اہر کا خزانہ اور حسن کی دولت پیش کی  
 کیونکہ مشترکین اپنی کامیابی کے لیے صرف ایک ہی ہتھیار استعمال نہ  
 کرتے تھے بلکہ جب دیکھتے تھے کہ درستی اور شدت سے بدعا حاصل نہیں ہوتا  
 تو نرمی اور ملامت کو کام میں لاتے تھے اور دوستی اور غمخواری کے لباس  
 میں دشمنی کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ کفار قریش میں سے ایک  
 شخص جو بڑا ذی وجاہت اور صاحب مال و منال تھا اپنے گروہ کے  
 اشارہ سے آپ کے بہکانے کو آیا اور خلاف معمول نہایت ملامت اور  
 شیریں کلامی کے ساتھ بولا

اے فرزندِ برادر تم صاحبِ اوصافِ جمیلہ اور عالی خاندان ہو پھر  
 کیا سبب ہے کہ ہمارے معبودوں کو بے جا بھلا کہتے ہو۔ اور ان کی سپریش  
 کی وجہ سے ہم کو احمق اور پاگل بتلاتے ہو اور ہماری قوم میں پھوٹ  
 ڈال دینے کی کوشش کرتے ہو۔ کیا اس سے مقصود ہے کہ کسی حسین  
 و جمیل عالی خاندان عورت سے تمہاری شادی ہو جائے اگر یہی  
 مدعا ہے تو جس کو تم پسند کرو ہم اس سے ابھی تمہارا نکاح کیے دیتے  
 ہیں! اگر ال وزیر مطلوب ہو تو اس قدر جمع کر دینے ہیں کہ تم سب  
 سے زیادہ دولت مند بن جاؤ۔ اور اگر حکومت و سرداری کی تمنا ہے  
 تو تم کو اپنا سردار بلکہ بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اس طرح تمہاری اہل

اور فرماں برداری کریں گے جس طرح بادشاہوں کی کی جاتی ہے اور

اگر کسی جن بھوت کا سایہ ہو گیا ہے اور تم اس کے دفعیہ سے عاجز ہو

تو کسی معالج کو لے آتے ہیں تاکہ تم کو تندرست کر دے!

یہ کہہ کر وہ چپ ہوا تو آپ نے پوچھا کہ بس کہہ چکا جو کچھ تجھ کو کہنا تھا اس نے  
کہا کہ ہاں آپ نے فرمایا بیٹھ جا اور سن۔ اور قرآن مجید کی یہ آیتیں ارشاد

کریں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَمْدٌ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ کِتٰبٌ فُضِّلَتْ اٰیٰتُهُ قُرْاٰنًا

عَرَبِیًّا لِّقَوْمٍ یَعْلَمُوْنَ ۝ بَشٰیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۝ رَغِیْبًا مِّنْ مَّنْ وَّجْہِ

یعنی یہ فرمانِ خدا کے رحمن و رحیم کے حضور سے صادر ہوتا ہے۔ یہ قرآن

کتاب ہے جس کی باتیں زبانِ عربی میں سمجھدار لوگوں کے لئے تفصیل کے

ساتھ بیان کر دی گئی ہیں۔ ماننے والوں کو خوشخبری خدا کی خوش خبری

سناتا اور منکروں کو عذابِ خدا سے ڈراتا ہے۔ اس پر بھی ان میں سے اکثروں

نے منہ موڑ لیا۔ اور وہ اس کو سنتے ہی نہیں۔ اور اسی پیغمبر یہ لوگ یہ بھی کہتے

ہیں کہ جس بات کی طرف تم ہم کو بلا لے ہو ہمارے دل تو اس سے پڑوس

میں ہیں کہ تمہاری بات ہمارے کانوں میں ایک طرح کی گرائی ہو کہ تم جو کہتے

ہو سنائی نہیں دیتا۔ اور ہم میں اور تم میں ایک طرح کا پردہ حایل ہو کہ تم

ہم پر کسی طرح کا اثر نہیں ڈال سکتے تو اس سے بہتر یہ کہ تم اپنے طور پر عمل

کئے جاؤ ہم اپنے طور پر عمل کر رہے ہیں۔ اسی پیغمبر تم ان لوگوں سے کہو کہ میں  
 بھی تم ہی جیسا بشر ہوں مگر مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود میں ہی ایک  
 معبود ہے۔ پس سیدھے اس کی طرف منہ کیے چلے جاؤ اور اس سے اپنے  
 گناہوں کی معافی مانگو اور شرک کرنے والوں پر افسوس کرو۔ جو لوگ ایمان  
 لائے اور نیک عمل کیے ان کے لیے آخرت میں بڑا اجر ہے جو کبھی موقوف  
 ہونے والا نہیں (خلاصہ یہ کہ آپ نے اس منوی کی حکمتی چٹری باتوں پر کچھ  
 بھی التفات نہ فرمایا اور وہ مایوس واپس چلا گیا۔ اس تدبیر کی ناکامی کے بعد  
 مشرکوں نے مسلمانوں پر اور بھی زیادہ ظلم کرنے شروع کیے۔ اور بالآخر وہ  
 وقت آیا جب آخری ہمد و دمساز یعنی آپ کے چچا ابوطالب نے بھی ساتھ  
 چھوڑنا چاہا۔ جس کا جواب ادولوا العزم رسول برحق کی زبان سے فقط یہ  
 ملا کہ چچا جان اگر قریش میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند  
 رکھیں تب بھی اپنے اعلان حق سے باز نہ آؤں گا۔“

نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنی بالآخر حق کا میاب ہوا لیکن کیا اس

کا میابی سے واعی حق نے خود کوئی فائدہ حاصل کیا؟

مسجد نبوی کے صحن میں آپ کے سامنے مال غنیمت کے انبار لگ جاتے

تھے مگر خود اس انبار کو تقسیم کرنے والے شاہ کونین کی زندگی یہ تھی کہ آپ کہاں

کی چٹائی یا خالی زمین پر آرام فرماتے تھے۔ کاشانہ بنوت گوانوار الہی کا منہر تھا

تاہم اس میں رات کو چراغ نہیں جلتا تھا کئی کئی دن فاقہ سے شکم مبارک پر  
 دو دو تین تین پتھر بندھے ہوتے تھے گھر کا کام کاج خود کرتے کپڑوں میں پیچید  
 لگاتے گھر میں خود جھاڑو دیتے۔ دو دو دوہ لیتے۔ بازار سے سودا لاتے  
 جوتی بچھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے اونٹ کو اپنے ہاتھ سے باندھ کر اس کو  
 چارہ دیتے۔ غلام کے ساتھ ل کر آگوندھتے۔ **اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ**  
**عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ۔**

رسول خدا صلعم کی نبوت کو چار سال گزر چکنے کے بعد بھی مشرکین مکہ کی  
 مخالفت میں کمی آنے کے بجائے اور زیادتی ہو گئی۔ وہ مسلمانوں کو سخت سے  
 سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ آنحضرت صلعم نے تنگ آ کر مسلمانوں کو ملک حبش  
 میں پناہ لینے کی اجازت دی۔ وہاں کا بادشاہ نجاشی ایک نیک دل عیسائی  
 تھا۔ دشمنوں نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا اور اپنا ایک وفد نجاشی شاہ حبش  
 کے پاس بھیجا۔ کہ ہمارے چندنا سمجھ آدمیوں نے اپنا آبائی دین ترک کر کے ایک  
 نیا دین ایجاد کیا ہے۔ اور بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لی ہے۔ آپ ان کو  
 ہمارے حوالہ کر دیں۔ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا حضرت جعفرؓ  
 نے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تمام واقعات بیان کیے اور پھر  
 بادشاہ کے اس سوال پر کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ کے متعلق کیا کہتے ہو سورہہ مریم

کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں جن کو سن کر اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے مسلمانوں کو پناہ دی اور سردارانِ قریش کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا (یہ واقعہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ تیسرے باب میں قرآن مجید کی بے مثل تاثیر کے زیر عنوان درج ہوا ہے) سفارتِ حبش کی ناکامی اور حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مشرکین عرب کے غیظ و غضب کی آگ اور بھی زیادہ بھڑک اُٹھی۔ چنانچہ انھوں نے جھٹلا کر بنی ہاشم سے ترکِ موالات کر دی اور ان کا مکمل بائیکاٹ کر دیا۔ بنی ہاشم نے پہاڑ میں پناہ لی اور تین برس تک سخت مصائب پھیلتے رہے اسی اثنائیں آپ کی بیوی خدیجہؓ اور آپ کے چچا ابوطالب کی وفات آئیں۔ حضرت پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور کفار مکہ کا ظلم و ستم بہت بڑھ گیا۔ اور آپ کو قطعاً مایوسی ہو گئی کہ اب یہ لوگ بت پرستی سے باز نہ آئیں گے آپ نے مایوس ہو کر اپنے غلام زید ابن حارثہ کے ساتھ متوکلًا علی اللہ شہر طائف کا قصد فرمایا تاکہ شاید قوم بنی تقیف کو خدا تعالیٰ قبولِ اسلام کی توفیق دے اور وہ آپ کی حمایت و حفاظت پر آمادہ ہو جائے طائف مکہ سے مشرق کی طرف قریب ساٹھ میل کے ہو۔ اس تذکرہ کے سلسلہ میں سر ولیم میور اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں کہ "محمد کے اس طائف کے سفر میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی جاننا زانہ

دلیری پائی جاتی ہے۔ ایک ایک و تنہا شخص جس کو اُس کی قوم کے لوگوں نے بالکل چھوڑ دیا تھا اور اُس کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے خدا کے نام پر دلیرانہ آگے بڑھا جس طرح حضرت یونسؑ یونسؑ کو کئے تھے اور اُس نے ایک بت پرست شہر کو آگاہ کیا کہ توبہ کریں اور اُس کی رسالت کی تائید کریں۔ اس سے ایک نہایت قوی روشنی اس امر پر پڑتی ہے کہ اُس کو اپنے کام کے من اللہ ہونے کا کس شدت کے ساتھ یقین تھا۔

مگر طائف کے لوگوں میں کسی کو توفیق قبول اسلام نہ ہوئی۔ بلکہ قریش کی طرح اُن کو بھی طیش آگیا اور آنحضرتؐ کو ایذا میں پہنچائیں۔ لاچار آنحضرتؐ تین یوم کے بعد واپس تشریف لے آئے۔

اس واقعہ کو مسر و لیکم میور صاحب نے اپنی کتاب 'لائف آف محمدؐ' (جلد چہارم صفحہ ۳۱۳-۳۱۵) میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"پیغمبر عرب جس وقت طائف پہنچے بالکل تنہا اور بظاہر بے یار و مددگار تھے۔ مگر اُن کو پیام الہی پہنچانا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے اہل طائف کو جمع کیا اور ہدایت کی کہ تمہک سے باز آئیں اور توبہ کریں۔ لوگوں نے اُن کی تحقیر و تذلیل کی اور زخمی کر ڈالا۔ اور تیسرے دن شہر سے نکال دیا۔ آپ کے زخموں سے



خون جاری تھا آپ نے شہر سے کچھ فاصلہ پر اللہ تعالیٰ کو اپنا درد  
 دل سنا یا۔ اور اپنے کام کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے پھر مکہ واپس  
 آئے۔ جہاں اب ان کو کامیاب ہونے کی کوئی امید نہ تھی مگر ان کو  
 انجام کار اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور قادر مطلق پر بھروسہ تھا  
 جس کا وہ اپنے آپ کو رسول سمجھتے تھے۔ دنیا کی تاریخ کے صفحات  
 میں ان کا نگاہ مصائب کے جاننا زمانہ مقابلہ کی نظیر ڈھونڈے  
 نہیں مل سکتی جو حد درجہ کے یاس انگیز حالات میں طرح طرح کی  
 ذلتوں اور دھمکیوں اور ایذاؤں کے باوجود مسلسل تیرہ برس تک  
پینچتر عرب سے ظہور میں آیا۔ ان کے پائے استقلال میں سرِ مو  
 لغزش نہیں ہوئی وہ متواتر ناکامیوں کے باوجود برابر منکرین  
 مکہ کو راہ راست پر آنے اور توبہ کرنے کی ہدایت کرتے تھے  
 اور غضب الہی سے ڈراتے تھے۔ مگر وہ خود اور اس کے مخلص فقہ  
 مردوں اور عورتوں کا مختصر گروہ ہمیشہ تھیر و تزلزل کا آماجگاہ  
 بنا رہا۔ اور ان کی جان ہر وقت خطرہ میں تھی۔ مگر ان لوگوں کو  
 اپنے مستقبل پر نہایت پختہ اعتماد اور اطمینان تھا۔ آخر کار جب  
 ایک دور دراز مقام سے مکہ اور حفاظت کا وعدہ ہوا تو اپنے  
 سکون و اطمینان کے ساتھ اس وقت تک انتظار کیا جب تک

آپ کے سب پیروکاروں سے روانہ ہو گئے جس کے بعد وہ خود بھی  
 یکایک اپنے ناشکار گزار اور مفسد ہم وطنوں کو چھوڑ کر ترک وطن  
 کر گئے۔“

”اسٹنگٹن اور ونگ“ امریکہ کے ایک نہایت زبردست ادیب مورخ اور وائٹنگ  
 ہیں جن کی تصنیفات انگلستان میں بھی بڑی وقت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں  
 ۱۸۰۴ء-۱۸۰۶ء میں آپ نے تمام یورپ کا دورہ کیا اور آپ متحدہ کتابوں  
 کے مصنف ہیں۔ آپ نے اپنی مشہور و معروف کتاب ”محمد اور ان کے جانشین“  
 میں لکھا ہے کہ

”ہم کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ جس ناپاک اور عظیم الشان فریب  
 سے محمدؐ کو متہم کیا جاتا ہے اس سے ان کو آخر کیا نفع مقصود تھا۔ کیا  
 دولت مقصود تھی؟ خدیجہؓ سے شادی کر کے وہ پہلے ہی ولتمند  
 بن چکے تھے اور اپنے ”پرفریب الہام“ کے دعوے سے برسوں پیشتر  
 انہوں نے اپنی دولت بڑھانے کا کوئی رُحجان ظاہر نہیں کیا۔  
 کیا شہرت مقصود تھی؟ وہ اپنے وطن میں پہلے ہی سے دانشمندانہ اور  
 متدین مشہور تھے وہ مشہور و معروف خاندان قریش کے اس  
 شہرہ آفاق شاخ کے فرد تھے جو سب سے زیادہ معزز سمجھی جاتی  
 تھی۔ کیا وہ جاہ طلب تھے؟ کعبہ کی تولیت اور اس کے ساتھ

مقدس شہر مکہ کی حکومت پشت ہا پشت سے ان کے خاندان میں  
 چلی آتی تھی اور گرد و پیش کے حالات اور اپنے تعلقات کے لحاظ  
 سے اس رتبہ پر جلد پہنچ جانے کے وہ خود ہی مستحق تھے ان  
 دیرینہ عقائد کو ملیا میٹ کرنے کی کوشش کرنے سے جن میں وہ  
 خود پیدا ہوئے تھے انہوں نے مندرجہ بالا تمام توقعات کی  
 خود ہی جڑ کاٹ دی تھی انہیں دیرینہ عقائد پر دولت اور  
 اعزاز کا دار و مدار تھا ان پر حملہ کرنا مترادف تھا اپنے تہہ داروں  
 دوستوں اور تمام ہم وطنوں کی مخالفت اور دشمنی مشتعل کرنے کا  
 اور تمام اہل عرب کے دلوں میں جو کعبہ پرست تھے اپنی طرف سے  
 نفرت اور عداوت پیدا کرنے کا۔ کیا آپ کی تبلیغ کے ابتدائی  
 زمانہ میں کچھ ایسے توقعات پیش نظر تھیں جو ان کی نفس کشی کا معاون  
 بن سکتیں اور ان کو اپنا کام جاری رکھنے کی ترغیب دیتیں۔ مگر برخلاف  
 کسی قسم کے خوش گوار حالات کے انہوں نے اپنا کام ناکامی کی فضا  
 میں خفیہ طور پر شروع کیا۔ برسوں تک ان کو کسی قسم کی کامیابی  
 نہیں ہوئی۔ جوں جوں انہوں نے اپنے اصولوں کی علانیہ اشاعت  
 کی اور اپنے الہامات کا اعلان کیا لوگوں نے ان کے ساتھ تمسخر  
 کرنا شروع کر دیا۔ ان کی تحقیر و تذلیل پر کمر بستہ ہو گئے اور آخر میں

اُن پہاؤر ان کے دوستوں پر طرح طرح کے ظلم ہونے لگے یہاں تک کہ ان کے بعض قریب عزیز اور رشتہ دار غیر ملک کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور اپنی حفاظت کی غرض سے خود اپنے وجود کو مخالفین کی نظروں سے اُن کو پوشیدہ کرنا پڑتا تھا۔ اور انجام کار ان کو بھی لاچار اور عاجز ہو کر اپنا وطن چھوڑ کر ایک دور دراز غیر مقام میں پناہ لینی پڑی۔ آخر سا لہا سال تک ایک ایسی پرفریب روئی پر ان کو کیوں اصرار تھا جس نے اُن کی زندگی کے ہر قسم کے بنیادی مفاد پر ایسی عمر میں پانی پھیر دیا تھا کہ اُس کے بند بھرا زسر نو اپنی کھوئی ہوئی خوش حالی کی بازیافت اُن کے لیے بہت مشکل تھی۔

**مسٹر ٹامس کارلائل گویا اس کے جواب میں کہتے ہیں،**

ہیں صاحب۔ عمیق القلب چکدار سیاہ آنکھوں اور گہری روحانیت والا صحرائے عرب کا فرزند کچھ اور یہی خیالات اور نصب العین لیے ہوئے تھا وہ ایک خاموش مگر عظیم الشان شخص تھا اور ان لوگوں میں سے تھا کہ سوائے مخلص ہونے کے اُن کے لیے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ خود قدرت نے اُن کو مخلص بنایا تھا۔ ہستی کا خوفناک مگر شاندار راز اُس پر منکشف ہو گیا تھا۔ اب اتنی سفرا و حضر میں ہزاروں خیالات اُن کے دل میں ہجوم تھا میں کیا ہوں؟ یہ چیز جس کی کچھ تھاہ نہیں اور

جس میں رہتا ہوں جس کو لوگ دنیا کہتے ہیں کیا ہے؟ زندگی  
 کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں کس عقیدہ کو مانوں؟ میں کیا کروں؟ یہ  
 ایسے سوالات تھے کہ ہیبت ناک کوہِ حرا کی چٹان اور غارِ حرا کی  
 ہولناک خاموشی اور تنہائی اور وہ بڑے بڑے اجرامِ فلکی جو خاموشی  
 کے ساتھ نیلی اور روشن آسمانی فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں  
 ان کا جواب نہیں دے سکے۔ مدقوں ان سوالات کا کوئی جواب  
 نہیں ملا۔ آخر خدا کے الہام نے عقدہ کشائی کی۔ اور آسمانی تائید  
 کی بدولت محمدؐ نے جو نظامِ قائم کیا اس کے نتائج دنیائے دیکھ لیے۔  
**مسٹر جان ڈیون پورٹ** ایک برہمن منصف مزاج انگریز مصنف اور مورخ  
 جنہوں نے مسٹر گاؤفرے گلکسن کی طرح رسولِ خدا صلعم اور قرآن شریف کی تائید  
 میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام اپالوجی فار محمد اینڈ دی قرآن ہے۔ یہ کتاب  
 پہلی بار ۱۸۶۹ء میں لندن میں چھپی گئی۔ اور پھر دوبارہ ۱۸۸۲ء میں چھپی اپنی  
 اس کتاب میں آپؐ تخریر فرماتے ہیں کہ

”کیا یہ بات خیال میں آسکتی ہے کہ جس شخص نے اس نہایت ناپسندیدہ  
 اور حقیر برت پرستی کے بدلے جس میں اس کے ہم وطن (اہل عرب)  
 مدت سے ڈوبے ہوئے تھے۔ خدا سے واحد برحق کی پرستش قائم کر کے  
 بڑی بڑی دائم المائرا صلحا میں کیں مثلاً اولاد کوشی موقوف کی نشہ کی

پتروں کے استعمال کو اور قمار بازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچتا ہو منع کیا۔ کثرتِ ازدواج کا اُس وقت بہت زیادہ رواج تھا اُس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا۔ غرض کیا ایسے بڑے سرگرم مصلح کو ہم فریبی ٹھہرا سکتے ہیں۔ اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کی تمام کارروائی مکمل پر مبنی تھی نہیں ہرگز ایسا نہیں کہہ سکتے۔ بیشک محمدؐ بجز دلی نیک بینی اور ایمانداری کے اور کسی سبب سے ایسے استقلال کے ساتھ اپنی کارروائی پر ابتداء نزول وحی سے جو خدیجہؓ سے بیان کی آخر دم تک جبکہ عائشہؓ کی گود میں شدت مرض سے وفات پائی۔ مستعد نہیں رہ سکتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت اُن کے پاس رہتے تھے اور جو اُن سے بہت ربط و ضبط رکھتے تھے اُن کو کبھی کبھی اُن کی رویا کاری کا شبہ نہیں ہوا۔ اور کبھی اُنہوں نے اپنے نیک برتاؤ سے تجاوز نہیں کیا۔ بیشک ایک نیک اور صادق طبیعت شخص جس کو اپنے خالق پر بھروسہ ہو اور جو ایمان اور رسم و رواج میں بہت بڑی اصلاح کرے حقیقت میں صاف صاف خدا کا آلہ ہوتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا کا پیغمبر ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے اور وفادار خادم گزرے ہیں اگرچہ اُن کی خدمتیں کامل نہ تھیں اسی طرح محمدؐ کو بھی خدا کا ایسا سچا خادم کیوں نہ سمجھیں جس نے

خدا تعالیٰ کی خدمت ایسی ہی وفاداری سے کی جیسی اوڑھنے کی اور جو مثل اوروں کے پوری اور کامل نہ تھی۔ اس بات پر کیوں یقین نہ کیا جاوے کہ اُس کو اپنے زمانہ اور اپنے ملک میں اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت اور تعظیم سکھلانے کے لیے اور ان کی حالت کے مناسب اُن کو ملکی اور خلاق امور میں نصیحت کرنے کے لیے خدا نے بھیجا تھا۔ اور وہ راست بازی اور نیک کرداری کا واعظ تھا۔

اکتوبر ۱۸۶۹ء کے رسالہ کوارٹری ریویو (لندن) میں اسلام پر ایک آرٹیکل چھپا تھا جو زبان عبرانی کے ایک مشہور عالم نے لکھا تھا۔ اُس میں آنحضرت کے متعلق تحریر تھا کہ

تمام عمر اُن کو بڑے بڑے خطرے اور تکلیفیں پیش آئیں اُن سب کو اُنھوں نے کمال صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔ اُنھوں نے خدائے واحد کی پرستش اور عبادت کی تجدید ایسے طور پر کی جس کی کوئی نظیر و مثال نہیں پائی جاتی۔ اور علم الہیات کو ایسے پختہ اور معقول اصول پر قائم کیا جن کا ہمسر معدوم ہو۔ اُنھوں نے قوانین تمدن و اخلاق کو ایسا کمال پر پہنچایا جو اُس سے پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا۔ اُنھیں کی

۱۵ سٹر جان ڈیون پورٹ عیسائی مذہب کے عالم تھے۔ یہ جملہ اپنے ذاتی مذہب کی ساکھ حسن عقیدت پر مبنی ہے۔ مولف۔

وساطت سے انسانوں کی بہبودی اور رفاہ کے واسطے وہ ملکی و  
 مائی۔ دینی اور دنیوی قوانین کا مجموعہ حاصل ہوا جو اپنی نوع میں کتنا  
 اور بے نظیر ہو۔ آنحضرت ہی وہ شخص ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں  
 جزیرہ عرب کو فتح کر لیا اور مختلف قبیلوں کو مجتمع کر کے ایک مضبوط  
 اور طاقتور اور عظیم الشان قوم بنا دیا۔ جس نے اُس زمانہ کی مہذب  
 دنیا کے ایک جزو اعظم کو عرصہ قلیل میں مفتوح و مسخر کر لیا۔ کیا اس بات  
 کا خیال کرنا قرین عقل و انصاف ہے کہ ایسے کارہائے نمایاں ایک  
 لاچار اور ناتواں مصروع شخص سے عمل میں آئے ہوں گے ایسے کلمہ ہائے  
 نمایاں کا عمل میں آنا بجز اُس شخص کے جس کے تو اسے روحانی اور  
 جسمانی کامل اور صحیح ہوں اور کسی شخص سے ناممکن معلوم ہوتا ہو اور  
 اُس کی ماہیت تائید ربانی پر دلالت کرتی ہو؟

قیصر روم کے دربار میں جس وقت قاصد نبوی نامہ مبارک لیکر پہنچا تو اُس نے  
 ابوسفیان کو جنہوں نے اُس وقت تک دین اسلام قبول نہیں کیا تھا اور رسل  
 خدا صلعم کے سخت دشمن تھے اور اتفاق سے اُن دنوں وہاں موجود تھے اپنے

لہذا آنحضرت صلعم پر نزول وحی کے وقت جو حالت ظاہری ہوتی تھی متعصب عیسائی پادریوں نے اس کو  
 اپنی افسانہ میں ازراہ تعصب منصرع (مرگی) سے تعبیر کیا ہے۔ مولف



دربار میں بلوایا اور سردر بار فیصر روم اور ابوسفیان کے درمیان حسب  
ذیل گفتگو ہوئی:-

فیصر مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟ ابوسفیان نہایت شریف اور معزز

اس خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ کیا؟

اس خاندان میں کوئی اور بادشاہ گزرا ہے؟

جن لوگوں نے اس کے مذہب کو قبول کیا وہ امیرین یا غریب؟

اس کے پیرو بڑھاپے میں یا گھٹتے جاتے ہیں؟

جو لوگ اس پر اکیہارا ایمان لائے کیا ان

میں سے آگے چل کر کسی نے اس کا ساتھ

چھوڑا؟

دعوائے نبوت سے قبل اس کے چال چلن

کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے؟

ساری قوم میں بالاتفاق

”الامین“ تسلیم کیا جاتا تھا

کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ

بولنے کا بھی تجربہ ہوا ہے؟

اس جنگ میں کبھی اپنے عہد پیمان کی خلاف ورزی کی ہے؟

کبھی نہیں۔

آج تک کبھی نہیں۔

قیصر تم لوگوں نے اُس سے جنگ کی ہو؟ ابوسفیانؑ۔ ہاں۔

نتیجہ جنگ کیا رہا؟ " کبھی وہ غالب ہا۔ کبھی ہم

ایک بار اُس کو شکست بھی ہوئی

وہ کیا سکھاتا ہو؟ " کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت

کر کسی اور کو خدا کا شریک

نہ بناؤ۔ نماز پڑھو پالنا

اختیار کرو۔ سچ بولو بدی

سے بچو۔

یہ گفتگو ختم ہونے پر قیصر نے کہا کہ تم نے اُس کو شریف لہنسب بتایا  
پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندان سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اُس کے  
خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا  
کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہو۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس خاندان میں کوئی بادشاہ  
نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اُس کو بادشاہت کی ہوس ہو۔ تم مانتے ہو  
کہ اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ  
خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اُس کی پڑوسی  
کی پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب لوگ ہی ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم  
کیا کہ اُس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ وہ بڑھتا ہے۔

تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے  
 تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وہ  
 یقیناً پیغمبر ہے۔

ایک صاحب نے حال میں بمقام لکھنؤ مولف سے روایت بیان کی  
 کہ ۱۹۲۰-۲۱ء کے دوران میں جبکہ تحریک نان کو آپریشن (ترک موالات) ملک  
 میں زور شور سے جاری تھی اور ہندو مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کا بہت کچھ  
 چرچا تھا مہاتما گاندھی جی نے اجودھیا کے مقام پر اپنی ایک تقریر کے سلسلہ  
 میں بیان کیا تھا کہ جس زمانہ میں وہ قرآن شریف کے مطالعہ میں مصروف  
 تھے تو سورہ الم نشرح کی اس آیت کا مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔  
 وَ سَأَفْعَنَّا لَكَ ذِكْرًا (ترجمہ) اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کے  
 ذکر کا آوازہ بلند کیا) بعض علمائے جو مطلب سمجھایا اس سے اس آیت کی اہمیت  
 سمجھیں نہیں آسکی جس اتفاق سے جناب شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب  
 دیوبندی سے ملاقات ہوئی تو دریافت کرنے پر آپ نے آسانی سے  
 اس کا مطلب ذہن نشین کر دیا۔ یعنی آپ نے مجھ سے (مہاتما جی سے) پوچھا  
 کہ کیا دنیا میں کوئی ملک ایسا ہے جہاں مسلمان نہ ہوں۔ میں نے جواب دیا نہیں  
 اس پر فرمایا کہ جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں کم سے کم ایک مسجد کا وجود ضروری

اور ہر مسجد میں پانچوں وقت موڈن بہ آواز بلند خدا کی توحید کے ساتھ  
 آنحضرت صلعم کی رسالت کی صداقت کا اعلان کرتا ہے۔ اور جس طرح کہا  
 جاتا ہے کہ انگریزوں کی سلطنت میں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا یعنی اس  
 سلطنت کے کسی نہ کسی حصہ پر آفتاب ہر وقت روشن رہتا ہے اسی طرح شرقاً  
 غرباً فاصلہ (طول البلد) کے لحاظ سے دنیا کے مختلف مقامات میں ہر وقت  
 کسی نہ کسی نماز کا وقت ہوتا ہے۔ لہذا دنیا کے کسی نہ کسی گوشہ میں ہر وقت  
 آنحضرت صلعم کا نام مبارک پکارا جاتا ہے۔ کیا دنیا میں ایسا بے نظیر امتیاز  
 کسی اور بشر کو آج تک نصیب ہوا ہے کہ اس کا ذکر اور اس کی رسالت کی  
 تصدیق ہر روز پانچوں وقت دنیا کے ہر گوشہ میں اس طرح بہ آواز بلند کی  
 جاتی ہو۔ کیا دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت کے اثر سے کسی بڑے سے  
 بڑے بادشاہ کے نام کو عظمت نصیب ہوتی ہے۔ یا ہو سکتی ہے؟ دنیا میں آنحضرت  
 صلعم کے نام مبارک کا یہ چرچا اگر تائید الہی کا نتیجہ نہیں ہو تو آخر کس طاقت  
 اور اثر کا نتیجہ ہے۔ یہ واقعہ تو بظاہر معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اپنی ندرت اور  
 فوق العادت ہونے کے لحاظ سے تنہا یہی واقعہ آنحضرت صلعم کی صداقت کا  
 کافی ثبوت ہے۔ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگیم  
 کرشمہ و امن دل می کشد کہ جانیجا است  
 اللہم صل علی محمد و علی آلہ واصحابہ اجمعین ۵

## دوسرا باب

### کلام الہی کی بے نظیر فصاحت و بلاغت

تمام مسلمانوں کا یہ مستحکم عقیدہ ہے کہ قرآن مجید رسول خدا حضرت محمد صلعم کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے۔ اور وجہ اعجاز کیا ہے؟ بعض علماء قرآن مجید کی نہایت صاف اور مستقیم اور نثر اثر کرنے والی اور رجھانے والی فصاحت و بلاغت کو اس کا معجزہ قرار دیتے ہیں۔ اور اعجاز یہ ہے کہ اس کی فوج العادت تاثیر سے قلوب انسانی مستحضر ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام فصحاء و بلغاء عرب و عجم کی زبانیں اس کے مقابلہ میں گنگ کر دیں اور وہ اس کا جواب نہیں لاسکے۔ بعض کا قول ہے کہ وجہ اعجاز یہ ہے کہ ایک امی کی زبان سے ایسا کلام بلاغت نظام نظر بعض متکلمین کے نزدیک وجہ اعجاز قرآن مجید کا اظہار غیب اور اس کی پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہیں۔ اور بعض علمائے خیال کیا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی اعجاز اس کی وہ بے نظیر تعلیم و ہدایت ہے جس نے دنیا کی کاپاپٹ کروسی اور بنی آدم کی روحانی اور اخلاقی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ترقی تمدن کے لحاظ سے ربانی کرشمے دکھائے جن کی بدولت

ایسے ایسے وایم الاثر حافی نتائج ظہور میں آئے جنہوں نے عالم کو مجو حیرت  
 کر دیا اور آج تک کر رکھا ہے۔ متکلمین نے قرآن مجید کے اعجاز کے ان مختلف  
 پہلوؤں کو اختلاف رائے سے تعبیر کیا ہے۔ مگر جیسا کہ آئندہ صفحات سے ظاہر  
 ہوگا قرآن مجید اپنی مذکورہ بالا ہر خصوصیت کے لحاظ سے معجزہ ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگر م  
 کرشمہ و امن دل مسکند کہ جا اینجاست

حُسن بہت سی ادواؤں کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے مگر اس مجموعہ کی ہر وہ ادا  
 جو کسی اہل نظر کے حتمی جاذب نظر اور جاذب توجہ ثابت ہو اس کے نزدیک  
 بجائے خود حسن ہی کسی کو گلاب کے پھول کی صورت پسند ہے کوئی اس کی  
 پیکھڑیوں کی نزاکت سے متاثر ہوتا ہے۔ کوئی اس کی خوشبو کا شیدہ ہے۔ کوئی  
 اس کی طبیی تاثیر کا قدر شناس ہے۔ کوئی اس کی پتیوں کی معین شمار و تریب  
 میں صنایع ازلی کی صنعت مشاہدہ کر کے وجد کرتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید سراپا  
 معجزہ کامل ہے اور جن تفصیلات کا اوپر ذکر ہوا ان میں سے ہر ایک بجائے  
 خود وجہ اعجاز ہے۔

اے ترا باہر دے رازِ دگر ہر گدار ابر درت نازے دگر  
 جس کلام کو کلام الہی کہا جائے اس کے جانچنے اور پرکھنے کا یہی ایک  
 طریقہ ہے کہ دیکھا جائے کہ انسان سے اس قسم کا کلام صادر ہونا ممکن ہے یا نہیں

اگر انسان سے اُس جیسا کلام ظہور میں آنا ناممکن ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کلام الہی ہے۔

قرآن مجید کی سب سے بڑی اور سب سے نرالی خصوصیت جو اُس کو اوہ تمام آسمانی کتابوں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اُس کا نہایت شد و مد سے یہ دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا کلام ہے۔ لہذا بے مثل اور بے مانند ہے۔

۱۔ چنانچہ سورہ ہود میں ارشاد ہوتا ہے  
 اَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاہُ ط قُلْ فَا تَوْبَعْتُمْ سَوَیْمًا مِّثْلَہٗ مُفْتَرِیٰتٍ  
 وَاذْعُوْا مِّنْ اَسْتِطْعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۵  
 یعنی کیا کافر قرآن کو کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہے تو ایسی پیغمبران سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اُس کی دس سورتوں ہی کی مانند تم بھی یوں ہی بنا لاؤ۔ اور خدا کے سوا جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لئے بلا لو۔ (رکوع ۲۷)

۲۔ پھر سورہ طوس میں ارشاد ہوتا ہے اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقْوٰلَہٗ ج بَلْ لَّا یُوعِیْنَہٗ فَا لَیْسَ لَہُمْ اِیْمٰنٌ ۵  
 یعنی کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن از خود بنا لیا ہے (مگر یہ ان کا اپنا کہنا ہے) بلکہ راسل بات یہ ہے کہ یہ ایمان ہی لانا نہیں چاہتے۔ اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو اسی طرح کا کلام یہ بھی بنا کر لائیں۔ (رکوع ۲۷)

۳۔ سورہ بنی اسرائیل میں اس سے بھی بڑھ کر یوں ارشاد ہوتا ہے قُلْ لَیْسَ

جُمِعَتْ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ يَّاتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ  
لَا يَآتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَّلَوْ كَانُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظٰهِرًا ۝

یعنی اگر پھیران سے یہ کہہ دے کہ اگر جن اور انسان اس بات پر متفق ہو  
کہ اس قرآن کی مثل بنا لیں تو اس کی مانند نہ لاسکیں گے اگرچہ ایک  
دوسرے کے مددگار بھی ہوں۔ (رکوع ۱۰)

۴۔ پھر سورہ یٰسین میں اذہر نوران صادر ہوتا ہوا مَ لَيَقُوْلُوْنَ اَفْتَرٰٓءُ  
قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرٰٓةٍ مِّثْلِهٖ وَاذْعُوْا مِّنْ اَسْطٰٓعَتِكُمْ مِّنْ دُوْنِ  
اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

یعنی کیا کا فرقان کی نسبت کہتے ہیں کہ یوں ہی بنا لیا ہو تو اسی پھیر  
ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اس کے ایک ٹکڑے ہی کی مانند تم بھی  
لاؤ اور خدا کے سوا جس کو وہ دے کے لیے بنا سکتے ہو بلا لو۔ (رکوع ۴)

۵۔ سورہ بقرہ میں تو صاف صاف اعلان فرما دیا گیا ہو کہ منکرین ہرگز قرآن  
کی ایک سورہ کے مانند بھی کوئی کلام پیش نہ کر سکیں گے۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ سَرٰٓيِبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرٰٓةٍ  
مِّنْ مِّثْلِهٖ ۙ وَاذْعُوْا شٰهِدًا اَنْ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ  
فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا۔

(یعنی اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر قرآن اتارا ہے اگر تم کو



اُس میں شک ہو کہ یہ کتاب خدا کی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہی اور اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس جیسی ایک سورہ تم بھی بنا لاؤ۔ اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بھی بلا لو۔ پس اگر (اتنی سی بات بھی) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے۔ (النجم رکوع ۳)

یہ کیسا عجیب و غریب ماجرا ہے کہ جب سے دنیا قائم ہوئی ہے کسی کتاب نے آج تک اپنے بے مثل اور بے مانند ہونے کا عظیم الشان دعوے ایسے صاف صاف اور کھلے کھلے الفاظ میں نہیں کیا۔ اور پھر یہی نہیں کہ پوری کتاب کی مانند دوسری کتاب تیار کر دینے کا مطالبہ ہو۔ بلکہ تمام فصحاء عرب و عجم کو چیلنج (تحدی) دیا گیا تھا کہ ساری کتاب کے مانند دوسری کتاب بنانا تو رہا ایک طرف قرآن مجید کی ایک سورہ کی مانند ہی بنا لاؤ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی بعض سورتیں مثلاً سورہ کوثر اور سورہ اخلاص صرف تین تین آیتوں کی دو تئیں ہیں جو ایک ایک سطریں لکھی جاسکتی ہیں۔ لہذا دوسرے الفاظ میں ساری دنیا کو لکارا گیا تھا کہ اگر تم کو قرآن مجید کے کلام الہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسی ایک سطر ہی بنا لاؤ۔

یہ آیات شریف جن میں کلام مجید کے بے مثل ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے سب مکہ میں نازل ہوئیں۔ جبکہ مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ اور وہ اپنے اہل وطن کے مظالم کا شکار بنے ہوئے تھے۔ اور گونا گوں مصائب میں مبتلا تھے

لہذا یہ چیلنج کسی مساوی رتبہ کے فرق کو نہیں دیا گیا۔ بلکہ ایک مظلوم گروہ کی طرف سے سارے ملک کو دیا گیا تھا جو ان کی مخالفت پر تلا ہوا تھا۔

چونکہ زمانہ نزول قرآن میں اہل عرب کو اپنی فصاحت و بلاغت کا بڑا ہی دعوے تھا۔ شعرا و موزوں کو دینا ان کے نزدیک ایک معمولی بات تھی۔ لہذا یہاں تک مختلف مضامین میں ایسے برجستہ اشعار کہہ دیا کرتی تھیں کہ آج اچھے سے اچھا ادیب ان کی مثل نہیں کہہ سکتا۔ تو ایک ان پر پینچمبر کا ان لوگوں سے پکار پکار کر یہ کہنا کہ اس طرح کی ایک ہی سوتہ بنا لاؤ۔ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ لہذا تقریباً تمام علما اور مفسرین کی یہ رائے ہے کہ خدا نے قرآن کے من اللہ ثابت کرنے کو یہ معجزہ قرار دیا ہے کہ ویسا صحیح و بلیغ کلام کوئی بشر نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ آج تک کسی نہیں کہہ سکا۔ پینچمبر خدا صلعم کے زمانہ کا کوئی واقعہ ایسا نہیں جو قلمبند نہ ہوا ہو۔ بعثت سے قبل اور بعد آنحضرت کے موافق اور مخالف ہر بہرات کتب احادیث و سیر میں پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہے اگر کسی نے کلام مجید کے اس چیلنج کو قبول کر کے اس کے مقابلہ میں کبھی کوئی کلام پیش کیا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ وہ آج تک صینہ راز میں رہتا اور اس کا کہیں مذکور نہ ہوتا۔ بلکہ مشرکین مکہ نے تو جو آنحضرت صلعم کی تکذیب اور توہین و تذلیل میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے اس

بشری کلام کی نشر و اشاعت میں چوٹی سے ایسری تک کا زور لگا دیا  
 ہوتا۔ مکہ اور مدینہ میں قریش اور دیگر مشرکین عرب کے علاوہ بے شمار سیانی  
 اور یہودی آباد تھے جن کے غیر ممالک سے تعلقات تھے۔ اور جو رسول خدا  
 صلعم سے بغض و عداوت رکھتے تھے۔ اگر قرآن مجید کے اس دعوے کی  
 تردید میں کبھی کوئی کلام پیش ہوا تھا تو اس قسم کے زبردست مخالفین کی  
 موجودگی میں ایسے اہم واقعہ کا اٹھانا ممکن تھا۔ غرض سارے تیرہ سو  
 برس گزر گئے کہ وہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک امی نے دنیا سے  
 ایک باہنہ نہیں۔ دو بار نہیں بلکہ کئی بار تھدی کی کھٹی کہ وہ اس کلام کے  
 ایک چھوٹے سے ٹکڑے ہی کی مانند کلام پیش کرے۔ تو کیا یہ معجزہ نہیں  
 کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گزر گیا مگر ایک آواز بھی اس تھدی  
 کے قبول کرنے کے لیے بلند نہیں ہوئی۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین  
 اُس وقت جب ایک امی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں  
 پڑھ سکتا تھا۔ یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شایع ہوا۔ اُس وقت عرب  
 کے قبیلہ قبیلہ میں بڑے بڑے زبان آور شعرا اور آتش بیان خطبار موجود  
 تھے مگر اس صورت سردی کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔  
 کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ  
 کیں۔ انہوں نے ان کوششوں کے سلسلہ میں جان و مال قربان کیا۔

اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو شدید مخالفت پر ابھارا۔ اپنی جانیں تہلیلوں پر رکھیں۔ ان کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پر سے جانے۔ ان کے ولتمندوں نے اپنے خزانے کھول دیے۔ ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے رسول خدا صلعم کی مخالفت پر تمام قبائل عرب کو بھڑکا دیا۔ یہ سب کچھ کیا مگر ان سے یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورۃ کا جواب پیش کر سکیں جو اسلام کے دعوائے صداقت کے مستحکم قلعہ کو چشم زدن میں مسہار کر دیتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز رہے۔

قرآن مجید کی جو آیتیں اوپر درج ہو چکی ہیں چونکہ ان میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت و جہ اعجاز قرآنہ دی گئی ہو اس لیے سرسید احمد خاں صاحب مرحوم اور ان کے ہم خیال متعصبین کی یہ رائے ہو کہ کسی کلام کا بے نظیر ہونا اس بات کی تو بے شبہ دلیل ہو کہ وہی مانند کوئی دوسرا کلام نہیں۔ مگر اس کی دلیل نہیں ہو کہ وہ خدا کی طرف سے ہو کیونکہ بہت سے کلام انسانوں کے دنیا میں ایسے موجود ہیں کہ ان کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں آیا۔ مگر وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے۔ جب انسانوں کے کلام بے نظیر موجود ہیں اور وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے تو پھر قرآن مجید میں ایسی کیا خصوصیت ہو کہ اس کا بے مثل اور بے مانند ہونا من اللہ ہونے کی دلیل قرار دی جائے۔ اس

بنا پر سرسید مرحوم اور ان کے ہم خیال لوگوں کی رائے ہے کہ مذکورہ بالا آیتوں میں جو تھدی ہو اس کا یہ منشا ہے کہ اگر قرآن کے من اللہ ہونے میں شبہ ہو تو کوئی ایک سورہ ایسی بنا لاؤ جو قرآن جیسی ہادی اور رہنما ہو۔

سرسید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنے قول کی تائید میں کسی ایسے انسانی کلام کا نام نہیں بتلایا جس کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک سرا کلام نہ ہوا ہو۔ ورنہ اس کلام کی نسبت غور ہو سکتا کہ آیا حقیقت میں اس کو دنیا نے لاثانی تسلیم بھی کیا ہے یا یہ محض سرسید مرحوم کی ذاتی رائے تھی۔ البتہ انگلستان کے مشہور موٹخ اپروردین نے دہے الفاظ میں یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر قرآن مجید کی تحریر متعدد انسانی سے متجاور ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈیماستھنیز کی فلیکس کو کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنا چاہیے؟

ہر قوم فطرثا اپنے شاعر کو سب سے زیادہ بلند مرتبہ پر دیکھنا پسند کرتی ہے۔ زمانہ قدیم کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریوں اور تذکروں کی کوئی انگریزی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے جو تعریف یونان کے مشہور شاعر ہومر کی کتاب ایلیڈ کی دوج ہو وہی تعریف اٹلی کے مشہور شاعر ورجل کی کتاب اینیڈ کی آپ لکھی پائیں گے! انگلستان کے شاعر ڈراڈن نے اپنی ایک نظم میں انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن کو ہومر اور ورجل دونوں شاعروں پر ترجیح دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ تین شاعر تین مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے۔ ہومر

خیالات کی بلند پروازی میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا۔ اور ورجل شوکت الفاضل اور اسلوب بیان میں لاثانی تھا اور ملٹن ان دونوں شاعروں کے وصفیات بدرجہ کمال اپنے میں رکھتا تھا۔

ہومر کی ایلید کے متعلق ایک طرف کہیں کی رائے ہے۔ دوسری طرف ڈرائڈن کی رائے ہے۔ دونوں انگلستان کے باشندے ہیں۔ مگر ڈرائڈن شاعر ہی لہذا بمقابلہ کہیں کے شعرا کے کلام جانچنے کا زیادہ اہل ہے۔ اسی حالت میں ان تین شاعروں میں سے کسی ایک کے کلام کو متعدد انسانی سے متجاوز قرار دینا ایک ایسے مورخ کی شخصی رائے ہے جو خود شاعر نہیں۔ اہل فارس کو حق ہے کہ وہ فردوسی کے شاہنامہ اور نظامی کے سکندرنامہ سعدی کی گلستاں۔ اور مولانا روم کی مثنوی کو ہومر کی ایلید کی طرح لاجواب سمجھیں۔ معلوم نہیں ایڈورڈ کین نے شیکسپیر کے مقبول عام کلام کو اس موقع پر مثال کے طور پر کیوں پیش نہیں کیا۔ رہ گئیں ویما سٹہینز کی فلیکس ویما سٹہینز یونان کے مشہور شہر اٹھنٹر کے فصحا میں البتہ بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ فلیکس اس کے وہ فصیح و بلیغ تقریریں کہلاتی ہیں۔ جو اس نے فلپ شاہ مقدونیہ کے خلاف اپنے ہم وطنوں کے جذبات برنگیختہ کرنے کے لیے اپنے ملک میں کہیں۔ اگر ویما سٹہینز کی یہ تقریریں محیر العقول قرار دی جائیں تو پھر بے شمار عرب فصحا و بلغاری کی نسبت ایڈورڈ کین کیا رائے

قائم کریں گے جنہوں نے اپنی زبان کی سی ترقی دی تھی اور فصاحت و بلاغت میں وہ کمال بہم پہنچا یا تھا کہ ایک ایک فصیح صاحب تقریر و خطیب کہلاتا تھا قبیلوں کے قبیلوں کو فقط اپنے کلام کے زور سے جس ارادے سے چاہتا روک لیتا۔ اور جدھر سما پھرتا جھونک دیتا۔ اور ان کو اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنی زبان آوری اور آتش بیانی پر اس قدر ناز تھا کہ اپنے مقابلہ میں وہ ساری دنیا کو محجم یعنی گونگا کہتے تھے۔

خیر یہ تو سب پرانے قصبے ہیں۔ حال میں چند سال کا عرصہ ہوا ہندوستان جیسے وسیع ملک میں مہاتما گاندھی کی تحریک ترک عادات اور کسانوں میں پنڈت جو اہر لال نہرو کی لگان نہ ادا کرنے کی تحریک کے سلسلے میں ان سیاسی لیڈروں کی تقریروں اور تحریروں نے برطانیہ جیسی بردست اور عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ میں جو اثرات پیدا کیے ان کے مقابلہ میں ڈیپاسٹہینز کی "فلیکس" کی کیا حقیقت ہے۔ لہذا امر ایچ خاں صاحب مرحوم اور ایڈورڈ گبن کے اس قول کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی کہ دنیا میں انسانوں کے ایسے بہت سے کلام موجود ہیں کہ ان کی مثل فصاحت و بلاغت میں آج تک دوسرا کلام نہیں ہوا۔ باریں ہمہ وہ من اللہ تسلیم نہیں ہوتے۔ اسی سلسلہ میں ہم سٹرگبن سے یہ سوال کرنے کا بھی حق رکھتے ہیں کہ کیا ہو مر اور ویاسٹہینز کے

زمانہ نے کے یونانیوں نے اپنی زبان کو اس قدر ترقی دی تھی اور اس میں  
 ایسا کمال بہم پہنچا یا تھا جیسا کہ حضرت محمد صلعم کے زمانہ میں اہل عرب نے  
 اپنی زبان کو ترقی دی تھی اور اس میں کمال بہم پہنچا یا تھا۔ اور کیا ہو  
 اور ویسا سہنتر نے اپنے کسی ایسے دعوے کے اثبات کے لیے جیسا کہ  
 صاحب قرآن صلعم کا دعوے رسالت اور نبوت کا تھا اپنی ایلید یا فلپس  
 کو دلیل گروانا تھا کیونکہ معجزہ کے لیے تہدی یعنی معارضہ کا طلب ہونا  
 شرط ہے اور کیا ان دونوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے کبھی علانیہ یہ  
 کہا تھا کہ اگر تمام جن و انس مشفق ہو جائیں تو بھی کوئی ایسی کتاب نہ لایے  
 جیسی کہ ایلید یا فلپس۔ اور کیا ان کا کوئی نامی گرامی خرید و خرید شاعر  
 ایلید یا فلپس کی چند سطر پڑھ کر بے اختیار بول اٹھا تھا کہ سوائے  
 اس شخص کے جس پر وحی نازل ہوتی ہو کوئی بشر ایسا کلام نہیں کر سکتا  
 اور پھر کسی طرح کے اجبار و اکراہ یا ترغیب و تخریب کے بغیر اپنا دیرینہ  
 اور بانی عقیدہ چھوڑ کر ہو مر یا ویسا سہنتر کے قول پر ایمان لے آیا تھا  
 اور کیا اسی زمانہ کے فصحا اور بلغا ایلید اور فلپس کے معارضہ اور مقابلے سے  
 عاجز آکر اپنے خداؤں کو بچانے کے لیے یہ دشمنی کے ساتھ مجادلہ و مقاتلہ پر  
 مجبور ہوئے تھے۔ اگر ان میں اس قسم کی کوئی تاثیر نہیں تھی اور ایلید صرف  
 ایک فصیح نظم ہوا اور فلپس چند بلغیہ سپچیں اور تقریریں ہیں تو کہیں صاحب کا



یہ بے دلیل قول کہ اگر قرآن کی تحریر استعداد انسانی سے بڑھ کر ہو تو ہوم  
کی ایلٹیڈ اور ڈیپاسٹہنز کی فلکس کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنی چاہیے۔ قرآن مجید  
کے اس دعوے کو رد نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی فصاحت و بلاغت اور تاثیر کے  
اعتبار سے یکتا اور بے مثل ہے۔ لہذا کلام الہی ہے۔

کسی کلام کی فصاحت و بلاغت کی جانچ کے لیے کوئی کسوٹی بھی تو  
ہونی چاہیے۔ اور یہ کسوٹی اُس کلام کی تاثیر اور اپنی فصاحت و بلاغت کی  
تاثیر کے لحاظ سے ایلٹیڈ اور فلکس اور دنیا کی کوئی کتاب قرآن مجید کی پرت تاثیر  
اور ہوگا۔ خیر فصاحت و بلاغت کی بے مثالی اور بے نظیری کا مقابلہ  
نہیں کر سکتی۔ اسی وجہ سے قرآن مجید کا بے مثل اور بے مانند ہونا اُس کے  
من اللہ ہونے کی دلیل گردانی جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ بفرض محال کسی بشر کا کوئی ایسا فصیح و بلیغ کلام  
حقیقت میں موجود بھی ہو جس کی مثل دنیا میں کوئی دوسرا کلام موجود  
نہیں تو اُس کے کمال اور قرآن مجید کے اعجاز میں زمین آسمان کا فرق  
ہے۔ اس کلام بشری کی خصوصیت تو صرف اتنی سی ہے کہ کسی ہم عصر مصنف  
نے اُس قسم کی تصنیف کی کوشش ہی نہیں کی۔ نہ اُس قسم کی کوشش کرنے کی  
ضرورت ہی پیش آئی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس بشری کلام کے  
بے مثل ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کیونکہ صاحب کلام کے کسی معاصر یا

ہم قوم نے اس کو بے مثل اور بے مانند تسلیم نہیں کیا۔  
 نیز یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ جن شعرا یا مصنفین کا کلام  
 فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بے مثل سمجھا جانے کے قابل ہو ان کا کمال  
 محض ایک خاص صنف کلام سے مخصوص ہوتا ہے۔ کلام کے دیگر اصناف  
 میں وہی شاعر اور مصنف بالکل پھیکے اور بے نمک ثابت ہوتے ہیں۔  
 کوئی رزم کار و میدان ہے۔ کوئی بزم کا۔ کوئی غزل سرائی میں معاصرین پر  
 فوق لے گیا کسی کی مثنوی مشہور ہوئی کسی نے قصیدہ گوئی میں نام  
 پایا کوئی ظرافت نگاری میں مشہور ہوا کسی نے مدح سرائی میں استاد کی  
 درجہ حاصل کیا کسی نے ہجو نویسی میں فروسی دیوان حافظ تصنیف نہیں  
 کر سکتے تھے اور حافظ شیرازی انوری و خاقانی جیسے قصائد لکھنے سے معذور  
 تھے۔ عمر خیام سے اگر کوئی مرثیہ لکھوانے کی فرمائش کرتا تو غالباً وہ ایک شعر  
 بھی نہ لکھ سکتے بعدی کوئی شاہنامہ یا سکندر نامہ نہ لکھ سکے نہ لکھ سکتے تھے  
 یہی حال تمام نامور شعرا اور مصنفین کا ہے ایسے ناقص کمال کو کلام الہی  
 کے ہمہ گیر اعجاز کے مقابلہ میں پیش کرنا سورج کے سامنے چراغ دکھلانا  
 کا مصداق ہے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کسی خاص دائرہ میں  
 محدود نہیں ہے اور پھر جو گونا گوں اور ہمہ گیر مباحث قرآن مجید کا موضوع  
 ہیں ان غیر معمولی اور بلند پایہ مباحث پر بلحاظ فصاحت و بلاغت کسی

بشر کے کلام کے بے مثل ہونے کا تو آج تک کسی نے بھی مطالبہ نہیں کیا۔ مثلاً  
 توحید اور خدا پرستی۔ فنا اور بقا۔ موت و حیات۔ جسم و روح۔ دنیا و آخرت  
 حشر و نشر۔ ثواب و عذاب۔ سعادت و شقاوت۔ طہارت و نجاست۔  
 عبادت و ذکر الہی۔ حوادث و انقلابات۔ رضوان و تسلیم۔ صبر و شکر۔ بیع و شراء  
 خیر و شر۔ مساوات و اخوت۔ اصول تمدن۔ اصول سیاست و جہانبانی  
 وغیرہ۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کی یہی ہمہ گیری اور ساتھ ہی  
 مضامین کی ندرت اور بلند پروازی ہی تو تھی جس نے عرب کے بڑے بڑے  
 فصحا و بلغاء کے چھکے چھڑا دیئے۔ اور ان سب نے اس کے سامنے گھٹنے بکا دیئے  
 اور اپنے سکوت سے عملاً اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

بشری کلام کے برخلاف قرآن مجید نے (۱) اول تو یہ دعویٰ کیا  
 کہ میں بے مثل ہوں (۲) ساری دنیا کو چیلنج دیا کہ اگر تم مجھے کلام الہی نہیں  
 سمجھتے تو میری جیسی ایک سطوی بنا لاؤ (۳) قرآن مجید نے جس قوم کو  
 چیلنج دیا وہ فصاحت و بلاغت میں اپنے لاثانی ہونے کی مدعی تھی۔  
 (۴) وہ فصحا اور بلغاء جو اس چیلنج کے مخاطب تھے ان میں سے بڑے بڑے  
 نامور زبان آوروں نے اعتراف کر لیا کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت  
 اور تاثیر کلام بشری سے بالائز اور صرف اس کلام کی تاثیر سے متاثر

ہو کر انہوں نے اسلام قبول کر لیا (۵) قرآن مجید کے مخاطب صاحب قرآن کے حد درجہ مخالف اور دشمن تھے مگر باوجود متواتر چیلنج اور ہر طرح کی کوشش کے وہ اس مقابلہ میں عاجز ثابت ہوئے۔ چونکہ ہومر کی ایلید یا کسی دوسرے بشری کلام کے لاثانی ہونے کی تائید میں ایسے وجوہ ہست نہیں کیے جاسکتے لہذا قرآن مجید کا بے مثل اور بے مانند ہونا اس کا مخصوص اعجاز ہے۔ اور اس کے من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔

بعض متشککین کا خیال ہے کہ جن لوگوں کی زبان عربی نہیں ہے وہ اس کی فصاحت و بلاغت سے نا آشنا ہیں لہذا قرآن کی فصاحت و بلاغت ان پر حجت نہیں ہو سکتی۔ یہ اعتراض ہمارے دعوے کا متناقض نہیں ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں اور کوئی قوم فصاحت و بلاغت کی مدعی نہ تھی جس قوم کو دعویٰ تھا ہی زبان میں قرآن نازل ہوا۔ اور ان ہی کو چیلنج دیا گیا۔ اور جب وہ قوم عاجز ہو گئی تو دوسری قوموں کو بھی اس کے بے مثل فصاحت و بلاغت تسلیم کرنی پڑے گی مثلاً پنجہ کشتی اور کشتی پہلوانی کے دوفن ہندوستان سے مخصوص ہیں۔ ممالک یورپ اور امریکا میں ان کا رواج نہیں۔ فن کروگاماں پہلوان کشتی کے فن میں اپنے بے نظیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اخبارات کے ذریعہ سے دنیا کے تمام پہلوانوں کو چیلنج دیتا ہے کہ اگر کسی کو حوصلہ ہو تو میرے ساتھ کشتی لڑے۔ ظاہر ہے کہ اس چیلنج کے مخاطب

ہندوستان کے پہلوان ہوں گے کیونکہ دوسرے ممالک میں تو آرمانی کے اس طریقہ کار و رواج ہی نہیں ہے۔ اگر ہندوستان کا کوئی پہلوان گاماں کے مقابلہ پر نہ آیا تو ظاہر ہے کہ مغربی ممالک میں بھی گاماں پہلوان کشتی کے فن میں بے نظیر ہونا تسلیم کیا جائے گا۔ مغربی ممالک میں فن کشتی کا رواج نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے پہلوانوں کا گاماں کے چیلنج کا مخاطب نہ ہو سکتا۔ گاماں کے کمال میں خارج نہیں ہو سکتا۔

جن علما کا خیال ہے کہ قرآن شریف کا بے مثل ہونا صرف اس کی ہدایت کے لحاظ سے ہے تو اس پر بھی ایک حد تک یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ عوام جیسی جاہل وستی غیر مہذب اور نا ترتیب یافتہ قوم کا قرآن مجید کے حکیمانہ اور پراز و قایت و معارف مضامین کے مقابلہ میں اس کے ایک سورہ کے مانند کلام نہ لاسکتا کوئی ایسی بڑی یا اہم بات نہ تھی جو اس کلام معجز کے لئے باعث فخر و مباحات ہوتی۔

مگر جس طرح بعض متکلمین کے نزدیک فصاحت و بلاغت کا چیلنج صرف عرب سے ہی مخصوص سمجھا جاتا ہے اسی طرح یہ اعتراض بھی صرف اہل عرب ہی کے متعلق ہو سکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ بہ لحاظ ہدایت چونکہ قرآن مجید کی مخاطب ساری دنیا ہے لہذا یہ آخری اعتراض چنداں اہم نہیں ہے۔ صرف بطور الزامی جواب کے اس کا ذکر ہوا ہے۔

# تیسرا باب

## قرآن مجید کی بے مثل تاثیر

قرآن مجید کے دلکش اسلوب بیان اور اس کی دل پر اثر کرنے والی اور بچھانے والی بے مثل فصاحت و بلاغت کے دوز بردست ثبوت ہیں ایک تو جیسا کہ دوسرے باب میں مذکور ہوا تمام فصحاء سے عرب کا اس کے مقابلہ سے عاجز رہنا اور دوسرے صرف اس کلام سے متاثر ہو کر ایسے ایسے ذمی اثر شدید مخالفین کا اسلام قبول کرنا جو رسول خدا کے جان کے لاگو تھے اور ان کو قتل کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جس وقت قرآن مجید نے اپنی بے نظیر فصاحت و بلاغت کا دعویٰ کر کے اپنے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مانند کفار سے بشری کلام کا مطالبہ کیا تو اس وقت حسان ابن ثابت لبید بن ربیعہ عامری۔ عامر بن اکوع۔ طفیل بن عمرو۔ زید الخلیل۔ زبرقاں۔ شماس۔ اسود بن سریع۔ کعب بن زبیر۔ عبداللہ بن واہ وغیرہ جیسے عرب کے شہرہ آفاق اور آتش بیان شاعر اور فصحا موجود تھے مگر قرآن مجید کے سامنے ان سب نے سر نیاز خم کر دیا۔ حضرت عمر بن خطاب کے قبول اسلام کا واقعہ زبان زد خاص و عام ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے

پیشتر نہایت تیز و تند مزاج تھے اور نہایت بہادر اور دلیر تھے اور مکہ میں  
 بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ رسول خدا کے سخت دشمن تھے ایک روز  
 تو اربابانہ کر اس قصد سے گھر سے نکلے کہ جا کر آنحضرتؐ کو شہید کر ڈالیں مگر رہتے  
 میں نعیم بن عبداللہ ملے اور ان کا ارادہ معلوم کر کے کہا کہ محمدؐ کو قتل کرنے  
 کیا جا رہے ہو پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو۔ تمہاری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید  
 وہ نون محمدؐ پر ایمان لاکر مسلمان ہو چکے ہیں۔ یہ سن کر ان کو سخت طیش آیا  
 اور سیدھے بہن کے گھر پہنچے اتفاقاً وہ اور ان کا شوہر اور اصحاب رسول  
 میں سے ایک شخص جو ان کو قرآن پڑھا یا کرتا تھا اور اقبا میں لیے ہوئے  
 سورہ طہ پڑھ رہے تھے کہ یکایک یہ ان پہنچے اور وہ ان کی آہٹ پا کر  
 چپ ہو گئے اور ورق کو چھپا لیا۔ جب ان کے پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ  
 ہم تو کچھ نہیں پڑھتے تھے تو طیش میں آکر بہنوئی پر جھپٹے۔ اور ان کی خوب خبر  
 لی۔ جب اس کی بیوی اس کے بچانے کے لیے اٹھی تو اس کو لہو لہان کر دیا مگر  
 آخر وہ بھلی ان ہی کی بہن تھی۔ اسلام کا منہ ایسا نہ تھا جو چڑھ کر اتر جائے۔  
 کہنے لگیں مگر تمہارے جو جی میں آئے کرو۔ ہم اسلام چھوڑنے سے رہے بہن  
 کا یہ استقلال دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔ پھر بہن کو لہو لہان دیکھ کر دل نہریا  
 اور نرم آواز سے پوچھنے لگے کہ اچھا بتلاؤ تم کیا پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ  
 بیچاری ڈرتے ڈرتے وہ ورق اٹھا لائیں۔ اور بہت کچھ عہد و قرار ہو کر ورق

ان کے ہاتھ میں دیا گیا۔ حضرت عمر نے پڑھنا شروع کیا جب پڑھتے پڑھتے  
 وہ اس آیت پر پہنچے إِنِّي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِي وَ  
أَقِمِ الصَّلَاةَ لِيذَكَّرَ لِي (یعنی ہم ہی اللہ ہیں۔ ہمارے سوا کوئی  
 معبود نہیں تو ہماری ہی عبادت کیا کرو اور ہماری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا  
 کرو) تو ان کے قلب پر ایسا اثر ہوا کہ سیدھے آنحضرت صلعم کی خدمت میں  
 میں پہنچے۔ اور آئے تھے آنحضرت صلعم کو قتل کرنے کی نیت سے مگر جاتے  
 ہی نہایت عاجزی سے عرض کیا کہ مجھے بھی دولت اسلام سے مالا مال کیجئے  
 اور پھر حرم کعبہ میں پہنچ کر غلامیہ کہہ دیا کہ میں تو محمدؐ اور ان کے خدا پر ایمان  
 لے آیا اور تمام دن مشرکوں کے ساتھ لڑائی اور مار پیٹ میں گزارا۔  
 تاریخ ابن اثیر جلد دوم صفحہ ۳۲-۳۳ و تاریخ ابوالفدا جلد دوم صفحہ ۱۱۹

۱۲۰ و تاریخ ابن ہشام صفحہ ۲۲۶-۲۲۷

حضرت عمرؓ کا ایمان لانا سب کو تسلیم ہو۔ جس وقت آپ ایمان  
 لائے کل مسلمانوں کی تعداد ۳۸ تھی اور یہ سب مسلمان اس قدر مغلوب  
 اور مقہور تھے کہ گھر کے اندر چھپ کر نمازیں پڑھا کرتے تھے حضرت عمرؓ  
 نے سب سے پہلے اصرار کیا کہ کعبہ میں چل کر کھلے بندوں نماز پڑھی جائے  
 اب سوال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کی تاثیر نے آپ کی کایا پیٹ نہیں کی تو آخر  
 وہ اور کیا اسباب تھے جو آپ کے ایمان لانے کے محرک ہوئے جو واقعہ



اوپر بیان ہوا یہ سب تاریخی واقعہ ہے جس کی آج تک کسی نے تکذیب نہیں کی۔  
 مکہ معظمہ کے پاس بمقام "عکاظ" برسویں دن ایک میلہ لگتا تھا اور تمام عرب  
 کے لوگ اور نامور فصحا اور بلغاء وہاں جمع ہوتے تھے اس میلہ میں بڑے  
 بڑے نامور شعرا اپنے قصیدے اور اشعار پڑھ کر سُناتے تھے۔ اور جو  
 قصیدہ پسند ہوتا تھا تمام میلہ میں اس کی دھوم مچ جاتی تھی اور ہرن  
 بکری یا اونٹ کی جھلی یا ریشمی کپڑے پر سنہرے حروف میں نقش و نگار سے  
 مزین کر کے کعبہ کی دیوار پر اس کو آویزاں کیا جاتا تھا اور معلقہ کہلاتا تھا  
 چنانچہ سُبْحًا مَعْلَقَةٌ جو عربی کے نہایت مشہور و معروف سات قصیدے  
 ہیں انہیں میں سے ہیں۔ کعبہ کی دیوار پر قصیدہ کا آویزاں ہونا بڑا ہی  
 موجب فخر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مصنف کے پاس قبیلوں سے  
 مبارکباد کے پیام آتے تھے۔ الغرض ان کا سرمایہ ناز لے دیکر ایک ہی  
 زبان تھی جس پر وہ نہایت اترتے تھے اور اپنے مقابلہ میں تمام  
 دنیا کو گونگا اور بے زبان (عجم) بتلاتے تھے جب خدانے اپنے فضل و کرم  
 سے ان لوگوں کی ذلیل اور زبون حالت پر رحم کھا کر خود ان ہی میں سے  
 ایک شخص کو (دل و جانم فدائے نامش باد) ان کی تعلیم و ہدایت کے  
 لیے کھڑا کیا۔ اور ان پر اپنا کلام نازل فرمایا۔ تو اقتصائے وقت سے ضرور  
 تھا کہ وہ کلام جو نہ صرف قوم عرب بلکہ تمام اقوام عالم کی ہدایت و تعلیم

کے لیے نازل ہوا تھا اپنی معنوی خوبیوں اور روحانی برکتوں کے علاوہ لفظی لطافتوں اور ظاہری کمالیوں سے بھی ایسا مملو اور معمور ہو کہ اس کی مثل دوسرا کلام پیش کرنا ناممکن ہو تاکہ وہ قوم جاہل جو شکات و دقائق علم میدار و معاویہ سے بالکل ناواقف اور بے خبر۔ صرف کلام کی ظاہری خوبی یعنی فصاحت و بلاغت ہی کو ایک بڑی چیز سمجھے ہوئے تھی اس کے معارضہ سے عاجز ہو کر اس کو کلام الہی جانے اور اس پر ایمان لائے چنانچہ یہی سبب تھا کہ جب کافروں نے اس کلام پاک کے من اللہ ہونے میں شک کیا اور کبھی جادو اور کبھی شعرا و کبھی کاہنوں کا کلام بتلایا تو خدا نے بطور حجت اور دلیل صداقت اپنے رسول کے اسی چیز میں ان سے معارضہ چاہا جس کا ان کو بڑا گھمنڈ تھا اور نہ صرف ایک بار بلکہ کئی بار۔

عرب کا سب سے بڑا نامی گرامی شاعر جو دنیا میں اپنی بے نظیر اور بے عدیل ہونے کا مدعی تھا اور جس کا نام لپیدا تھا۔ سورہ بقرہ کی چند آیتیں پڑھ کر بے اختیار چلا اٹھا کہ خدا اور اس شخص کے سوا جس پر وحی نازل ہوتی ہے کوئی انسان ایسا کلام نہیں کر سکتا۔ اور فوراً شرک و بت پرستی چھوڑ کر خدا پرست مسلمان بن گیا۔

جارج نیل انگلستان کا ایک مشہور مستشرق ہے (۱۶۹۰-۱۸۶۳ء) جس نے

قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس نے اپنے ترجمہ قرآن مجید کے ویساچہ میں لہٹپلٹا کے ایمان لانے کے واقعہ کی تصدیق کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

”یہ بات بالعموم مسلم ہے کہ قرآن قریش کی بولی میں جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے۔ انتہائی لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے۔ وہ بے شک عربی زبان کا نمونہ ہے اور زیادہ پکے عقیدے کے لوگوں کا یہ قول ہے۔ نیز اس کتاب سے بھی ظاہر ہے کہ کوئی انسان اس کے مثل نہیں لکھ سکتا۔ اور اسی واسطے اسے لازوال معجزہ قرار دیا ہے جو مردہ کے زندہ کر دینے سے بڑھ کر ہے۔ اور تمام دنیا کو اپنے ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے اور خود محمدؐ نے بھی اپنی رسالت کے ثبوت کے لیے اس معجزہ کی طرف رجوع کیا تھا۔ اور بڑے بڑے فصحاء عرب کو جہاں کہ اس زمانہ میں اس قسم کے ہزار ہا آدمی موجود تھے جن کا محض یہ مشغلہ تھا کہ طرز تحریر اور عبارت آرائی کی لطافت میں سب سے زیادہ لائق و سائق ہو جائیں، علانیہ کہلا بھیجا تھا کہ اس کے مقابلہ کی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔ اس بات کے اظہار کے واسطے کہ اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان ذی بیاقت لوگوں نے بھی فی الواقع تعریف اور توصیف کی تھی جن کا اس کام میں مبصر ہونا مسلم ہے۔ منجملہ بے شمار مثالوں کے ایک مثال کو بیان کرتا ہوں

”لبیدین ربیعہ عامری جو محمد کے زمانہ میں سب سے بڑے زبان آورد  
 میں تھا اس کا ایک قصیدہ خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا۔ یہ قصیدہ  
 صرف نہایت اعلیٰ درجہ کی تصنیف کے لیے مرعی تھا۔ (نوٹ: مشہور و معروف  
 قصائد ”سبعہ معلّٰتہ“ میں سے چوتھا قصیدہ وہی ہے جس کا ذکر مسٹر سیل  
 نے اپنے اس بیان میں کیا ہے۔ مولف) اور کسی شاعر کو اس کے مقابل  
 میں کسی اپنی تصنیف کے پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی بلکہ جبکہ  
 کچھ عرصہ کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ (بقرہ) کی آیتیں اس کے مقابلہ  
 میں لگائی گئیں تو خود لبید بن ربیعہ اس زمانہ میں مسترکین میں سے تھا  
 شروع ہی کی آیت پڑھ کر بحر بحر میں غوطہ زن ہوا۔ اور فی الفور اسلام  
 قبول کر لیا اور بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے  
 صادر ہو سکتے ہیں“

اس کے بعد آگے چل کر مسٹر سیل لکھتے ہیں کہ

قرآن کا طرزِ تحریر عموماً خوش آئند اور رواں ہے۔ بالخصوص اس جگہ جہاں  
 وہ پیغمبرانہ شعرا اور توہینتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر اور بعض مقامات  
 میں ہنس ماز اور مسترقی ڈھنگ کے مطابق پرچیرت صنعتوں سے مرصع  
 اور روشن اور پرمعنی جملوں سے مزین ہے۔ اور اکثر مقامات میں خصوصاً  
 جہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان آتا ہے نہایت اعلیٰ مرتبہ

اور رفیع الشان ہے۔

کیا ان ہزار ہا فصحا اور بلنبا میں جن کا بقول مسٹر پیل صرف یہ مشغلہ تھا کہ طرز سخن اور عبارت آرائی کی لطافت میں لائق اور فائق ہو جائیں۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو ایک ایسے شخص کا کہ جو نہ کسی مکتب میں بیٹھا نہ کسی استاد سے پڑھا اور نہ کسی شاعر سے شعر کہنا سیکھا مقابلہ کرتا اور قرآن کے طرز کے چند چھوٹے چھوٹے فقرے لکھ کر اُس کے دعوے کو رو کر دیتا۔ اور اس طرح اپنی قوم اور اپنے خداؤں کو اُس ذلت و رسوائی سے بچا لیتا جن کی پیغمبر عرب سے ان کو شکایت تھی کہ وہ کرتے ہیں۔ اور باوجود اس بار بار چیلنج کے کوئی فصیح و بلیغ شخص اُس کی تردید نہ کر سکا۔ اور وہ لوگ لفظی مقابلہ سے عاجز آ کر تیر و شمشیر کے ساتھ مقابلہ پر مجبور ہوئے تو صاف ثابت ہو کہ یہ ایک ربانی کوشمہ تھا جس نے تمام فصحاء و بلغائے عرب کو قرآن مجید کے مقابلہ میں لاچار اور عاجز کر دیا۔

اپنی تفسیر فتح المنان موسوم یہ تفسیر حسانی کی جلد ہشتم کے صفحہ ۲۶۱ میں جارج پیل کی طرح علامہ ابو محمد عبد الحق صاحب حسانی دہلوی نے سورہ کوثر کی نسبت بھی بیان کیا ہے کہ جب سورہ اَنَا اَعْطَيْنَاكَ الْكُوْثَرَ كُوْثِرًا مصرعوں کی شکل میں لکھ کر خانہ کعبہ پر اس غرض سے آویزاں کیا گیا کہ چوتھے مصرعہ کی جوجگہ خالی ہو وہ کوئی نامور شاعر پر کر دے۔ تو ایک شاعر نے یہ چوتھا مصرعہ اضاذہ کیا هَذَا لَيْسَ مِنْ قَوْلِ الْبَشَرِ (یعنی یہ بشر کا کلام ہی نہیں)

آنحضرتؐ کی نبوت کو چار سال گزر چکے تھے مگر کافروں کا ظلم برابر  
 بڑھتا چلا جاتا تھا۔ مسلمانوں کو سخت سخت ایذا میں پہنچاتے تھے۔ جب پانی نہر  
 سے گزر گیا تو آنحضرتؐ نے اپنے ستم رسیدہ اصحاب کو ملک حبش کی طرف  
 ہجرت کر جانے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ سب سے پہلے پندرہ شخص اپنے  
 پیارے وطن اور خانہاں سے دست بردار ہو کر وہاں چلے گئے۔ اس گروہ  
 میں ہمیشہ صاحب کی صاحبزادی رقیہؓ اور ان کے شوہر حضرت عثمان بن عفان  
 اور آنحضرتؐ کے پھوپھی زاد بھائی زبیر بن عوام بھی تھے۔ ان کے بعد اور  
 بہت سے مرد اور عورتیں جنھوں نے راہ خدا میں بڑی بڑی سختیاں کھیلیں  
 اور جن کی تعداد قریب ایک سو کے تھی حبش پہنچ کر ان کے شریک ہو گئے  
 اس جماعت میں آنحضرتؐ کے چچا زاد بھائی حضرت جعفر طیار بن ابی طالب  
 شریک تھے۔ دشمنوں نے وہاں بھی پہنچانہ چھوڑا اور بہت سے تحائف لیکر  
 نجاشی بادشاہ حبش کے پاس گئے جو ایک نیک دل عیسائی تھا۔ اور کہا کہ  
 ہمارے چند بے سمجھ آدمیوں نے ایک نیا دین ایجاد کیا ہے اور اپنے آبائی  
 دین سے پھر گئے ہیں اور بھاگ کر آپ کے ملک میں پناہ لی ہے انھیں آپ  
 ہمارے سپرد کر دیجئے۔ اور بادشاہ کو مشتعل کرنے کی غرض سے یہ بھی کہا  
 کہ یہ لوگ ہمارے ہی مذہب کو برا نہیں کہتے بلکہ آپ کے عیسائی مذہب  
 کو بھی برا کہتے ہیں یہ حالات سن کر نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں بلایا

اور پوچھا وہ نبی دین کیا ہے جس کی خاطر تم نے اپنے آبائی دین کو چھوڑ دیا اور ہمارا دین اختیار کیا نہ کسی اور قوم کا۔ اُس وقت حضرت جعفرؓ نے جو جناب علیؓ رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی تھے مسلمانوں کا بنائے ہوئے بن کر نجاشی کے سامنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان کیں اور بتلایا کہ ہم کس طرح گمراہی میں مبتلا تھے اور گناہوں سے آلودہ تھے پیغمبرؐ نے ہمیں صلاحت سے نکال کر کس طرح علیؓ مقام پر پہنچا دیا۔ تب اُس نے پوچھا کہ تم لوگ حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں کیا کہتے ہو۔ اس پر انھوں نے سورہ مریم کی وہ آیات جن میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہوا ایسے لب و لہجہ اور موثر انداز سے پڑھ کر سنائیں کہ بقول مستند مورخین کے نجاشی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ رو پڑا اور اُس نے اقرار کیا کہ قرآن مجید نے حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں جو کچھ بیان کیا ہے اس سے وہ ایک تنگے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے، اس کے بعد نجاشی نے قریش کے سرداروں کو جواب دیا کہ میں ان مظلوموں کو تمھارے حوالے نہیں کر سکتا۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم بلا خوف و خطر یہاں رہو۔ میری عملداری میں تم کو کوئی شخص اذیت نہیں پہنچا سکتا۔ اس واقعہ کا قرآن شریف میں بھی ذکر ہے۔ چنانچہ سورہ مادہ کے

گیارہویں رکوع میں ارشاد ہوتا ہے

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِمْ مَوَدَّةَ الَّذِينَ آمَنُوا أَلَا أَنَا صَاحِبُ  
ذَلِكَ بِأَن مِّنْهُمْ قَتِيلِينَ وَسَاءَ مَا أَنَا وَآلِهِمُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الْمُرْسَلِينَ تَرَىٰ أَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ  
 مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا شَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ (ترجمہ) اور مسلمانوں کے ساتھ دوستی  
 کے اعتبار سے سب لوگوں میں ان کو قریب تر پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ  
 ہیں مسلمانوں کی طرف نصاریٰ کا یہ میلان اس سبب سے ہے کہ ان میں  
 علماء اور مشائخ ہیں اور نیز یہ لوگ تکبر نہیں کرتے اور جب قرآن کو سنتے  
 ہیں اس رسول (محمدؐ) پر نازل ہوا ہے تو اسے مخاطب تو ان کی آنکھوں کو  
 دیکھتا ہے کہ ان سے آنسو جاری ہیں اس لیے کہ انھوں نے حق بات کو  
 پہچان لیا ہے۔)

مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیتیں نجاشی بادشاہ حبش اور اس کے رباہوں  
 کے حق میں نازل ہوئیں جو نصاریٰ تھے۔

ریورٹسٹر باسور کھڈا سمٹھ ایم۔ اے۔ انگلستان کے ایک مشہور و معروف  
 منصف مزاج محقق ہیں جنھوں نے ازراہ انصاف پسندی باوجود عیسائی  
 مذہب رکھنے اور باپوری ہونے کے رسول خدا صلعم اور اسلام کی تائید میں  
 ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام محمدؐ اور محمدؐ نرم ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۹ء میں بمقام  
 لندن شایع ہوئی تھی انھوں نے بھی اپنی اس کتاب میں مذکورہ بالا واقعہ  
 کا ذکر کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں

”کہ دن برس اور گزر گئے اور محمدؐ کے اصول مذہب باوجودیکہ چاروں



طرف سے نہایت سخت اندیشوں اور مزاحمتوں کی بوچھاڑ تھی صرف  
 اپنے اخلاقی ذریعوں اور اپنی ذاتی قوت سے اپنا راستہ صاف  
 کرتے جاتے تھے مگر جس قدر کہ ان کے پیرووں کی تعداد بڑھتی گئی  
 اسی قدر مخالفین کا تشدد اور ایذا رسانی بھی جو اس کے معتقدین  
 کو برداشت کرنا پڑتی تھی زیادہ ہوتی گئی۔ اور آخر کار محمد نے یہ  
 پسند نہ کر کے کہ اس کے پیرو اپنے نئے مذہب میں داخل ہوتے  
 ہی ایسے پر ملال امتحان میں مبتلا ہو جائیں انھیں یہ صلاح  
 دی کہ ملک حبش میں جا کر پناہ گزیں ہوں۔ چنانچہ پندرہ آدمیوں  
 نے اس کی صلاح مانی۔ اور محمد بدستور وہیں رہے۔ ان لوگوں  
 کا محمد کی صلاح مان لینا کچھ افسوس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ  
 اول تو اگر کسی ثبوت کی ضرورت ہو تو یہ ایک یقینی ثبوت اس  
 امر کا ہے کہ اس تمام زمانہ میں محمد کی اصل قوت اس شے میں تھی جس کو  
 دنیا اس کی کمزوری کہے گی (یعنی آپ کا بے یار و مددگار ہونا)  
 دوم یہ کہ اس واقعہ کے سبب سے جو ہجرت کہلاتا ہے اس میں  
 نبی عربی کی ابتدائی تعلیم کا ایک اعلیٰ درجہ کا خلاصہ ہاتھ آ گیا ہے  
 جو اب تک ہمارے پاس موجود ہے (نوٹ۔ یہ خلاصہ تعلیم و ہدایت  
 قرآنی کے ذیل میں نقل کیا جائے گا۔ مؤلف) قوم قریش نے نجاشی

بادشاہ حبش کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ ان فراریوں کو ہمارے  
 حوالے کر دو تاکہ ہم انہیں قتل کر ڈالیں۔ لیکن اس گروہ میں سے  
 جعفر نامی ایک شخص نے آگے بڑھ کر بادشاہ اور ان پادریوں  
 کے سامنے جو اس غرض سے بلائے گئے تھے اور انہیں ساتھ  
 لیکر آئے تھے اپنے تبدیل مذہب کے وجوہ بتلائے، (نوٹ۔  
 مسٹر باسور تھ اسمتھ صاحب نے اپنی کتاب میں حضرت جعفر کی تقریر  
 کا ترجمہ لکھا ہے۔ اور تاریخ ابن ہشام میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے خطبہ  
 کے اصل الفاظ نقل کیے گئے ہیں جن کا ترجمہ تعلیم و ہدایت قرآنی  
 کے سلسلہ میں آئندہ درج ہوگا۔ مولف) تبدیل مذہب کے  
 وجوہ بیان کرنے کے بعد حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب مشرکین  
 نے ہم کو نہایت عاجز کر دیا اور طرح طرح کے ظلم کیے اور نہایت حق  
 اور تنگ کیا اور ہمارے دین میں مزاحم ہوئے تو ہم اپنا وطن  
 چھوڑ کر اور تھج کو اور بادشاہوں کی نسبت بہتر سمجھ کر تیرے ملک  
 میں چلے آئے۔ اور یہ امید کر کے کہ تیرے ہوتے ہوئے کوئی شخص  
 ہم پر ظلم نہ کر سکے گا تیری پناہ اختیار کی۔ (اس تقریر کے بعد کا  
 واقعہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔)

انہیں قبایع غفار کے شاعر تھے انہوں نے جب آنحضرت صلعم کا چرچا سنا تو

چھپ کر مکہ آئے اور اس حضرت کی زبان مبارک سے کلام مجید کی کچھ آیتیں سن کر واپس چلے گئے ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے محمد کو کیسا پایا انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے تھے کہ وہ شاعر ہیں ساخر ہیں۔ کاہن ہیں۔ ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے۔ یہ ان کی بولی نہیں۔ ہم نے شعر کے ہر ایک وزن کو جانچا ہے۔ وہ شعر بھی نہیں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ محمد سچے اور قریش جھوٹے ہیں۔ (صحیح مسلم)

ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحب اثر شخص تھا۔ وہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں آیا اور فرمایش کی کہ کچھ پڑھ کر سناویے۔ آپ نے چند آیتیں پڑھیں اس نے مکر پر ٹھہرا کر سنیں۔ آخر بے خود ہو کر بولا قسم ہے کہ اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

حضرت عثمان بن مظعون نے کلام مجید کی چند آیتیں سن لیں اور فوراً حلقہ بگوشی اسلام ہو گئے۔ حضرت طفیل بن عمرو کے کانوں میں اتنا قہ قرآن مجید کی چند آیتیں پہنچیں اور وہ مسلمان ہو گئے۔ یہ سب تاریخی واقعات ہیں۔ اور صحیح احادیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔ کلام کی یہ شیرینی بہ نکمینی۔ یہ تاثیر اور یہ شیر جو دوسرے دشمن۔ موافق اور مخالف۔ شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہیں یہ اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟

مسٹر ٹامس کارلائل انگلستان کے نامور عالم و فاضل اپنی کتاب لکچرز آن  
ہیروز میں لکھتے ہیں کہ

اسلام قوم عرب کے حق میں گویا تاریکی میں روشنی کا آنا تھا۔ عرب  
کا ملک پہلے پہل اُس کے ذریعہ سے زندہ ہوا۔ اہل عرب  
گمہ باؤں کی ایک غریب قوم تھی اور جب سے دنیا بنی تھی عرب  
کے چٹیل میدانوں میں پھرا کرتی تھی اور کسی شخص کو ان کا کچھ خیال  
بھی نہ تھا۔ اُس قوم میں ایک اولوالعزم پیغمبر ایسے کلام کے  
ساتھ جس پر وہ یقین کرتے تھے بھیجا گیا۔ اب دیکھو کہ جس چیز سے  
کوئی واقف ہی نہ تھا وہ تمام دنیا میں مشہور و معروف ہو گئی  
اور چھوٹی چیز نہایت بڑی چیز بن گئی۔ اُس کے بعد ایک صدی  
کے اندر عرب کی ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف ہلی ہو گئی  
عرب کی بہادری اور عظمت کی تجلی اور عقل کی روشنی زمانہ ہاسے دراز  
تک دنیا کے ایک بڑے حقہ پر چمکتی رہی۔ اعتقاد ایک بڑی چیز  
ہو اور جان ڈالنے والا ہو جس وقت کوئی قوم کسی بات پر  
اعتقاد لاتی ہے تو اُس کے خیالات بار آور بند اور روح کو عظمت  
دینے والے ہو جاتے ہیں۔ یہی عرب اور یہی محمد اور یہی ایک صدی  
کا زمانہ گویا ایک چمگاری ایسے ملک میں پڑی جو ایک کسمپرس

تاریک ریگستان تھا۔ مگر دیکھو کہ اس تاریک ریگستان نے زور  
شور سے اڑ جانے والی باروت کی طرح نیلے آسمان تک اٹھتے  
ہوئے شعلوں سے دہلی سے غناطہ تک روشن کر دیا۔“

جان گوپہنہ جرمنی کا نہایت مشہور شاعر اور فلسفی گزرا، اس کا قول ہے کہ  
جس قدر ہم اس کتاب و قرآن شریف کے قریب پہنچتے ہیں  
یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں، ہم سے دور کھینچی جاتی ہے (یعنی  
زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے) وہ بتدیج فریفتہ کرتی ہے۔ پھر متعجب  
کرتی ہے۔ اور آخر کار فرحت آمیز تجربے میں ڈال دیتی ہے۔“

مکہ شریف میں جب آنحضرت صلعم نے اسلام کی تبلیغ شروع کی اور بعض چیدہ  
افراد نے اسلام قبول کر لیا تو قریش کا غیظ و غضب حد سے تجاوز کر گیا۔ لہذا  
آنحضرت کو اور ان کے اصحاب کی محقر تعداد کو طح طح کی ایندھن اور تکلیفیں  
دینے لگے۔ چنانچہ جن سبکیں مسلمانوں کا کوئی حامی اور مددگار نہ تھا ان کی مشکلیں  
باندھ کر اول خوب مارنے اور پھر ٹھیک دوپہر کی تیز و تند دھوپ میں  
بھلستی ہوئی زمین پر بھوکا پیا سا کبھی اونڈھا کبھی سپدھا لٹا دیتے  
اور بڑے بڑے بھاری بھاری پتھر چھپاتی پر رکھ دیتے جس کے بوجھ کے  
مارے زبان باہر نکل پڑتی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ ڈالتے۔ کسی کو نیزے یا تلوار سے  
زخمی کرتے اور کہتے یا تو محمد اور اس کے خدا کو گالیاں دو اور ہمارے بتوں

کی تعریف اور ان کے پوجنے کا اقرار کرو ورنہ اسی طرح عذاب دے دے کر تم کو مار ڈالیں گے۔ مگر یہ خدا کے سچے بندے اس شدید تکلیف اور اذیت کی مطلق پرواہ نہ کرتے اور ہر حال میں خدا کا شکر بجالاتے اور بعض اسی عذاب اور تکلیف کی حالت میں جان سے گزر جاتے۔

ظالم ابو جہل یا سرنام ایک صحابی کو بہت تکلیف دے رہا تھا یا سر کی والدہ سمیٹہ نے اس کو برا بھلا کہا اس ظالم نے طیش میں آکر سمیٹہ کے نیزہ مارا کہ ان کی جان نکل گئی۔ اسلام میں یہ خاتون سب سے پہلی شہید ہیں یا سر بھی اذیتوں کو برداشت نہ کر سکے اور دنیا سے چل بسے۔ یا سر کے والد عمار کی مشکلیں باندھ کر مکہ کی چلتی ہوئی پتھری زمین پر لٹا کر ان کے سینہ پر بہت بھاری پتھر رکھ دیا جاتا اور کبھی پانی میں غوطے دیئے جاتے مگر یہ اپنے ایمان پر قائم رہے یہی حال حباب بن ارت کا تھا کہ ننھا کر کے نہایت گرم زمین پر ڈال دیا جاتا۔ اور آگ سے گرم کی ہوئی پتھری بڑی بڑی سلیں ان کے سینہ پر رکھی جاتیں۔ اور سر کے بال کھینچ کر گردن مروڑی جاتی۔ مگر ان کو ان تکلیفوں کی سرمو پرواہ نہیں ہوتی۔ جب حضرت زبیر اسلام لائے تو آپ کا چچا آپ کو بوڑھے میں لپیٹ کر آگ لگا دیتا اور کہتا کہ اسلام چھوڑو مگر آپ فرماتے کہ ایسا ہرگز نہ ہوگا حضرت بلال نے دین کی محبت میں اپنی جان کو بیچ سمجھا اور ہر طرح کی تکلیف برداشت کرتے رہے یہاں تک

کہ مشرکین عاجز آگئے اور اپنے لڑکوں سے کہا کہ بلال کے گلے میں رسی باندھ کر مکہ کے ارد گرد گھسیٹتے پھر وہ بلال اس نازک حالت میں بھی "اعدا صحر بچا پتے" غرض اس قسم کے بے شمار مظالم ہوتے رہے۔ مگر کلام ربانی کی تاثیر نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسا گہرا اثر کیا تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں اپنی جان کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے گونا گوں صعوبتوں اور اذیتوں کی برداشت اور اسلام کی محبت فحش کلام الہی کی تاثیر ہی کا نتیجہ تو تھا ورنہ ان کی ثابت قدمی کا اور کیا ممکن سبب ہو سکتا تھا۔

جب آنحضرتؐ ہجرت کر کے مدینہ شریف میں رونق افروز ہوئے تو آپ ہمیشہ اہل مدینہ کو کلام الہی کا وعظ فرمایا کرتے تھے اور طائبان حق شرک و بت پرستی چھوڑ کر نہایت رغبت اور صدق دل سے مشرف باسلام ہوتے جاتے تھے چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُس قبیلہ کے تمام لوگ جس میں آپ شریف فرما تھے کیا مرد کیا عورت سب خدا کے دین میں داخل ہو گئے۔ اور اس معجزانہ دل ہلا دینے والے کلام کے اثر سے وہی حقانیت اور روحانیت ان کی طبیعتوں میں بھی سرایت کر گئی جو مہاجرین کے دلوں میں سمائی ہوئی تھی۔ چنانچہ سرولیم بیور اپنی کتاب "لائف آف محمدؐ" کی جلد دوم کے صفحہ ۲۷۱ پر ارقام فرماتے ہیں کہ

"یہودیوں کی حقانی باتیں عرصہ سے اہل مدینہ کے گوش گزار

ہو چکی تھیں مگر وہ بھی اُس وقت تک خوابِ خرگوش سے نہ چونکے  
جب تک کہ روح کو کپ کپا دینے والا کلامِ نبی عربی کا اُکھنوں  
نے نہیں سنا۔ تب البتہ دفعتاً ایک نئی اور سہرگرم زندگانی کا  
دم بھرنے لگے۔

کلامِ مجید کی جس حیرت انگیز تاثیر کی بدولت عربِ عیسیٰ جاہل اور وحشی قوم  
خدا پرست بن گئی اُس کی بابت مسٹر سٹیل قرآنِ مجید کے اپنے انگریزی ترجمہ  
کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

”دنیا میں اسی دین کو وہ قبولیت حاصل ہوئی جس کی کوئی مثال  
اور نظیر نہیں ہے۔ اور اس دین کو نہ صرف اُن قوموں نے قبول  
کیا جن پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہ کی تھی بلکہ اُن لوگوں نے  
بھی قبول کر لیا جنہوں نے اہل عرب کو اُن کی فتوحات سے  
خروم اور اُن کی سلطنت بلکہ اُن کے خلیفوں کا خاتمہ کر دیا اور  
اور جس میں کوئی بات اُس سے بڑھ کر تھی جو ایک مذہب میں عموماً جمال  
کی جاتی، اور جس کی وجہ سے اُسے ایسی عجیب ترقی نصیب ہوئی؛  
(نوٹ)۔ غالباً مسٹر سٹیل کا اشارہ تاتاریوں کے اسلام قبول کرنے کی  
طرف ہے۔ چنگیز خاں والی خراسان کے پوتے ہلاکو خاں نے ۱۲۵۶ء  
میں خلافت عباسیہ کا خاتمہ کر دیا اور دارالخلافہ بغداد کو تباہ کر ڈالا



مگر سترہ ہجری میں ہلا کو خاں کے ایک بیٹے نے اسلام قبول کر کے  
اپنا نام احمد خاں رکھا اور تاتاری بہ تعداد کثیر مسلمان ہو گئے (یوں)

آنحضرت مدینہ شریف میں بہ حیثیت فاتح یا حملہ آور کے داخل نہیں  
ہوئے تھے بلکہ اہل مدینہ کی دعوت پر صرف تبلیغ اسلام کی غرض سے تشریف  
لائے تھے۔ آپ کے پاس سوائے کلام الہی کے تبلیغ کا مطلق اور کوئی ذریعہ  
یا وسیلہ نہ تھا۔ اسی کلام پاک کی تاثیر سے لوگ مشرف بہ اسلام ہوتے تھے  
آنحضرت صلعم جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اُمّی محض تھے۔ لکھنا پڑھنا نہ جانتے  
آپ ف کلام الہی کو ہراتے تھے۔ جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوتا تھا۔ اسی کلام  
ربانی کی تاثیر سے مکہ میں اسلام پھیلا اور اسی کلام الہی کی بدولت اہل مدینہ  
دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔

مذکورہ بالا تمام واقعات کو پیش نظر رکھ کر سوچو اور غور کرو کہ جس  
کلام نے اس طرح بڑے بڑے فصحاء و بلغاء اور شرفاء عرب کا ناطقہ بند کر کے ہلام  
کے نور سے ان کے قلوب کو منور کر دیا یہ قرآن مجید کی تاثیر نہ تھی تو اور کیا تھا  
کیا دنیا کی تاریخ حضرت عمرؓ اور لبید بن ربیعہ جیسی نامور ہستیوں کی کاپاپلیٹ کی  
نظیر پیش کر سکتی ہو؟ ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۝

————— ❦ —————

## چوتھا باب

### آنحضرت محمد صلعم کی اُمیت کھنی قرآن مجید کا اعجاز اور

آنحضرت صلعم کے زمانہ سے پیشتر نیز حضرت کے زمانہ میں ملک عرب میں تعلیم کا کوئی معین یا باقاعدہ طریقہ جاری نہ تھا عربی میں علم کی صرف دو شاخیں تھیں۔ یعنی قدرتی فصاحت و بلاغت اور علم الانساب۔ ان کی تحصیل کے لیے کسی مکتب یا مدرسہ میں تعلیم پانے کی ضرورت نہ تھی۔ ان کا دار و مدار صرف ربانی تعلیم پر تھا۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں بے شمار آدمی لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے تھے اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کی تعداد بہت کم تھی۔

ایک روایت کے مطابق آغاز اسلام کے وقت سارے حجاز میں کل سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے دوسرا آدمی لکھتا ہے کہ پورے صوبہ حجاز میں اس وقت بہ مشکل چھ یا سات آدمی لکھنے پڑھنے سے واقف تھے۔ خلاصہ یہ کہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت ہی کم تھا۔ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے وہ اُمی کہلاتے تھے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کو لکھنا پڑھنا کچھ نہیں آتا تھا۔ نہ وہ خود کچھ لکھ سکتے تھے اور نہ دوسروں کا لکھنا پڑھنا سکتے تھے۔ اہل عرب سے آنحضرت کا لقب اُمی ہو گیا تھا۔ اس بیان کی تصدیق خود قرآن مجید

اور بے شمار معتبر اور مستند روایات اور احادیث سے ہوتی ہی۔ اور اس کے برخلاف ایک ہی معتبر روایت نہیں پائی جاتی۔ قرآن مجید میں متعدد موقعوں پر اس واقعہ کا اظہار ہوا، کہ آنحضرت صلعم ظاہری تعلیم اور نوشتہ خواندگی کے فارغ سے پاک تھے۔

چنانچہ سورہ اعراف کے انیسویں رکوع میں ارشاد ہوتا ہے: **الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ** (یعنی وہ جو ہمارے سے ان ان پڑھ نبی رسول کی پیروی کرتے ہیں)

پھر اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر بیسویں رکوع میں حکم ہوتا ہے: **وَمَا مَنَعَنَا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيَّ** (یعنی اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے ان پڑھ رسول نبی پر بھی)

پھر سورہ عنکبوت کے پانچویں رکوع میں فرمایا: **وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخِطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذْ أَسْرَقْتَ** (یعنی ایسی پیغمبر قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے پڑھاتے تھے اور نہ تم کو اپنے ہاتھ سے لکھنا ہی آتا تھا کیونکہ ایسا ہوتا تو یہ بے دین خواہی نہ خواہی شبہ کرتے)

مطلب یہ ہے کہ پیغمبر صاحب پڑھے لکھے تو تھے نہیں اس میں بھی خدا نے یہ مصلحت رکھی تھی کہ اگر پیغمبر صاحب پڑھے لکھے ہوتے تو منکر ضرور شبہ کرتے

کہ یہ باتیں جو یہ شخص سمجھاتا ہے اس کی دیکھی بھالی ہوئی ہیں۔ اگلی کتابوں میں سے چن چنا کر ایک قرآن بنا لیا۔ مگر پیغمبر صاحب کے امی ہونے کی وجہ سے یہ شبہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس پر بھی اگر انکار کریں تو ان کی نری ہٹ ہٹ ہری اور اسی طرح سورہ شوریٰ کے پانچویں رکوع میں دوہرایا گیا ہے مَا كُنْتَ قَدْرًا سَرِيًّا مَا الْكِتَابُ وَلَا الْاِيْمَانُ (یعنی تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کس کو کہتے ہیں)

آنحضرتؐ ہمیشہ قریش کے مجمع میں رہے کبھی ان کی آنکھوں سے اوہل نہیں ہوئے۔ مگر سے باہر بھی قریش کے جھرمٹ میں رہنا ہوا۔ اگر آپ نے ظاہری تعلیم پائی ہوتی تو شاعر مجنون اور ساحر کی طرح وہ اس الزام کا بھی اظہار کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ان کو اس کا یقین تھا کہ محمدؐ کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے داغدار نہیں ہے۔ ایک شبہ یہ تھا کہ محمدؐ کسی دوسرے سے سن کر یہ قرآن پیش کرتے ہیں قرآن مجید نے اس اعتراض کو نقل کیا۔ اور اس کا جواب بھی دے دیا۔ سورہ محل۔ رکوع ۴۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُولُونَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهُ بَشَرٌ لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَبِيْكُمْ وَهٰذَا لِسَانَ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ (یعنی) ای پیغمبر ہم کو تحقیق معلوم ہے کہ قرآن کی نسبت یہ شبہ کرتے ہیں کہ ہونہ ہو تم کو فلاں آدمی سکھایا کرتا ہے۔ سو جس شخص کی طرف سکھانے کی نسبت کرتے ہیں اس کی بولی تو عجیبی ہے۔ اور یہ

قرآن صاف عربی زبان میں ہی (مطلب یہ کہ قرآن کی عبارت بڑی فصیح عربی ہے) غیر ملک کا آدمی ایسی عمرہ عربی جان نہیں سکتا۔ تو وہ دوسرے کو کیا سکھائے گا۔ ایک نصرانی اپنی زبان میں انجیل پڑھا کرتا تھا۔ روایت یہ ہے کہ اُس کی نسبت بعض لوگوں نے شبہ کیا کہ آنحضرت اُس کی مدد سے قرآن تصنیف کرتے ہیں۔ خود قرآن مجید نے یہ شبہ قوی دلیل کے ساتھ دور کر دیا۔ درحقیقت اگر آنحضرت کو لکھنا پڑھنا آتا ہوتا تو ان کے صحابہ۔ رفقا اور متبعین اس بارہ میں ہرگز ساکت اختیار نہیں کرتے۔ اور ان کے ازواج مطہرات ان کے عزیز واقربا اور بالخصوص ان کے چچا جنھوں نے انھیں پالا تھا آپ کی تعلیم سے بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جس واپہ نے آپ کو پالا تھا (یعنی حلیمہ رضی اللہ عنہا) اُس کے اور اُس کے بیٹوں تک کے نام سے اور آنحضرت کے فلام کے نام سے تو بچہ بچہ واقف ہو مگر جس استاد سے آنحضرت نے تعلیم پائی تھی اور جس کے سامنے آپ نے زانو سے ادب کیا تھا اُس کے نام سے دنیاویوں نا واقف رہتی۔ اور پھر آپ یہ جہات کیوں کر فرما سکتے تھے کہ اپنے قبیلہ کے سامنے خلافت واقعہ اپنے آپ کو امی فرماتے اگر آپ امی نہ ہوتے تو قرآن مجید میں متعذبا آپ کے لیے یہ لقب استعمال ہونے پر مخالفین کو گرفت کا بہت آسان موقعہ ہاتھ آ جاتا۔ اور ایسی حالت میں کلام الہی کی صداقت پر ان کو ہرگز یقین نہ آتا۔

قطع نظر اس کے اس خفیہ بات کے چھپانے سے جناب پیغمبر خدا کو کیا فائدہ تھا اُن کا لکھا پڑھا ہونا منصب نبوت کے کسی طرح مخالف نہ تھا۔ اور نہ اس سے قرآن مجید کی شان اور اس کے معجزہ میں اور بے مثل فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق آسکتا تھا۔ کیونکہ حروف کے لکھ پڑھ لینے سے انسان فصیح و بلیغ نہیں بن سکتا خصوصاً ایسا فصیح و بلیغ جس کا مثل بڑے بڑے فصحا میں سے کوئی بھی نہ تھا۔

اسلام کے مورخوں میں سے کسی کو اس بات کا انکار نہیں کہ اُس زمانہ میں فن تحریر عرب میں راجح تھا۔ اور کچھ لوگ لکھنا جانتے تھے اور دوسروں کا لکھا ہوا پڑھ سکتے تھے۔ اُس زمانہ کے بڑے بڑے شاعر اپنے قصیدوں کو خانہ کعبہ کے دروازوں اور دیواروں پر آویزاں کرتے تھے چنانچہ قصائد "سبعہ معلقہ" اسی نام سے مسلمانوں میں معروف و مشہور ہیں۔ اُن کا قول صرف اس قدر ہے کہ فن تحریر کا رواج تو تھا مگر بہت کم۔ لوگ اُس کو جانتے تھے مگر بقابلہ نہ جاننے والوں کے اُن کی تعداد بہت قلیل تھی۔

ریورسٹیڈ جے۔ ایم۔ راڈویل صاحب جنھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اس نے اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ "ہمارے پاس اس امر کی کوئی شہادت نہیں ہے کہ ہمارے کتب مقدسہ کبھی محمد کو دستیاب ہو گئی ہوں۔ گو یہ صرف ممکن ہے کہ عہد عتیق یا جدید

کے ٹکڑے خریدیے یا ان کے چچا زاد بھائی و ساقہ بن نوفل یا مکہ کے اور عیسائیوں کے ذریعہ سے جن کے پاس ہماری مقدس کتاب کے قلمی نسخے موجود ہوں اس کے پاس پہنچ گئے ہوں اور یہ امر بھی ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ ہم کو کوئی صاف سراغ اس امر کا نہیں ملتا کہ کوئی عربی ترجمہ عہد عتیق یا جدید کا محمدؐ کے زمانہ سے پہلے موجود تھا۔

مشہور و معروف پادری ریورینڈ جان فنڈر صاحب نے اپنی کتاب میزان الحق کے باب سوم میں تصریح کی ہے کہ

آنحضرت تورات اور انجیل پڑھے ہوئے نہ تھے۔ یعنی زبان عبرانی ایرانی وغیرہ سے جن میں تورات و انجیل منقول تھیں ناواقف تھے؛

روایات میں بکثرت واقعات درج ہیں کہ یہود آپ کے پاس آتے تھے اور آپ سے وہ سوالات کرتے تھے جو ان کی کتابوں میں مذکور تھے جب آپ حضرت صلعم جواب دیتے تھے تو وہ مستحیر رہ جاتے تھے۔ اگر یہود کو یہ یقین نہ ہوتا کہ آپ امی ہیں تو ایسے سوالات کیوں کرتے۔ اور اگر سوالات کرتے بھی تو جواب سن کر یہ خیال کر لیتے کہ ہماری کتابوں کو پڑھ لیا ہے۔

ریورینڈ مسٹر بوسور تھہ اسمتھ صاحب ایم۔ اے اپنی کتاب محمد ایڈ محمد نریم (صفحہ ۳۴۰) میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

محمدؐ کو دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی حکومتوں کی سرداری حاصل  
تھی ان کے تہا وجود میں "قیصر اور پوپ" دونوں شامل تھے لیکن  
وہ پوپ تھے بغیر فوق القدرت دعویوں کے۔ اور قیصر تھے بغیر  
قیصری افواج کے؛

"بغیر کسی مستقل فوج کے۔ بغیر کسی دستہ محافظ (باڈی گارڈ) کے۔ بغیر  
رہنے کے محل کے۔ اور بغیر کسی معین آمدنی کے اگر کسی آدمی کو یہ کہنے کا  
حق تھا کہ میں مہنہ تا سیدالہی سے حکومت کرتا ہوں تو یہ دعویٰ صرف  
محمدؐ کو زیبا تھا۔ کیونکہ ان کو بغیر ظاہری وسائل کے اور بغیر کسی کی  
امداد کے ہر طرح کی طاقت حاصل تھی؛

"بالکل لامانی خوش قسمتی سے محمدؐ تین چیزوں کے بانی ہوئے۔ ایک قوم  
کے بانی دوسرے ایک عظیم الشان سلطنت کے بانی اور تیسرے  
ایک مذہب کے بانی محمدؐ خود تو آدمی تھے اور لکھنا پڑھنا نہیں جانتے  
تھے۔ مگر وہ ایک ایسی کتاب کے مصنف ہیں جو چار عناصروں پر  
مشتمل ہے یعنی جو ستر پانچواں۔ ایک مجموعہ ہے قوانین کا مجموعہ  
ہر دعاؤں کا۔ اور ساتھ ہی ایک بائبل بھی ہے۔ اس کتاب کی  
اس وقت تک ساری دنیا کی کل آبادی کا چھٹا حصہ تسلیم کرتا ہے  
اور اس کے پاکیزہ اسلوب بیان اور اس کی صداقت و ہدایت



کے لحاظ سے معجزہ تسلیم کرتا ہے۔ محمدؐ نے صرف اسی ایک معجزہ کا دعویٰ کیا  
 وہ اس کو اپنا ابدی معجزہ قرار دیتے تھے۔ اور حقیقت میں یہ معجزہ ہی ہے  
 لیکن زمانہ کے تقاضہ کا لحاظ کرتے ہوئے اور اس انتہا درجہ کی تعظیم و  
 تکریم اور جوش عقیدت کو پیش نظر رکھ کر جو محمدؐ کے پیروؤں کے دلوں  
 میں اپنے پیغمبر کی جانب سے ہے اور ان کا ازمنہ وسطیٰ کے مقدس  
 پیشواؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے میرے نزدیک محمدؐ میں سب سے  
 زیادہ حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے معجزے دکھلانے  
 کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ ان کے متقیدین نے البتہ ان سے ایسے معجزات  
 منسوب کئے جو ان سے صادر نہیں ہوئے۔ اور جن کے دکھلانے سے  
 وہ ہمیشہ انکار کرتے رہے۔ اس سے بلند تر ان کے اخلاص کا اور کیا  
 ثبوت ہو سکتا ہے؟

محمدؐ نے آخر عمر تک اپنے لیے صرف اسی ایک لقب کا دعویٰ  
 کیا جس کے ساتھ انہوں نے اپنا کام شروع کیا تھا۔ اور مجھے یقین ہے  
 کہ ایک ایسا دن ضرور آئے گا کہ بلند ترین فلسفہ اور سچی عیسویت  
 بھی ان کو اس لقب کا مستحق سمجھے گی۔ یعنی پیغمبر اور رسول خدا کا لقب۔

ایک ضعیف روایت ہے کہ آنحضرتؐ کو آپ کے چچا ابوطالب اپنے ساتھ ملک  
 شام کو لیے جا رہے تھے۔ راستہ میں بحیرا نام ایک راہب نے آپ کو دیکھا اور

آثار سے پہچان لیا کہ یہ پیغمبر ہوں گے۔ چنانچہ اُس نے ابوطالب کو مشورہ دیا کہ اُن کو مکہ واپس بھیج دو ورنہ یہود قتل کر ڈالیں گے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے اسی راہب کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ اگر یہ صحیح ہو تو دنیا کے لیے اس سے بڑھ کر معجزہ حضرت محمدؐ کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک ایجد ناشناس طفل نواز وہ سالہ لے چند گھنٹوں میں حقایق و اسرار دین۔ اصول عقائد۔ نکات اخلاق۔ مہمات قانون اور ایک شریعت عظمیٰ کی تکمیل و تاسیس کے طریقے سب کچھ سیکھ لیے۔ اور پھر اکو کوئی جانتا بھی نہیں۔ آخر اگر کوئی سکھانے والا ہوتا تو وہی نبوت کی شہرت دیکھ کر وہ کیونکر پر وہ گنہگار میں چھپا رہنا پسند کرتا۔ اور صحابہ کرام کی نگاہوں سے اُس کا وجود ہمیشہ کیونکر مستور رہتا۔ اور ان کا عقیدہ کیوں کر مستحکم رہ سکتا تھا۔ اور تقارُّ اُس سے استفادہ ہی کیوں کرنے دیتے۔ اور وہ خود ہی نبوت کا اعلان کیوں نہ کرتا۔

اب غور کا مقام ہے ایک امی محض جو امیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پلکے جوان ہوا۔ اُس نے ہوش سنبھالا تو گروہ پیش تار کیوں اور ظلمتوں کے سوا اُس کو کچھ نظر نہیں آیا۔ علوم و فنون اور تمدن و تہذیب سے ایک غاری ملک۔ عاری شہر۔ عاری خاندان کے اندر نشوونما پائی۔ جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا۔ خود اُس کا خاندان اور اُس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے آشنا نہ تھا۔ گزشتہ صفحہ انبیاء اور احوال کا عالیہ کا ایک

حرف اُس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علما اور دانشوروں کی صحبت اُس نے نہیں اٹھائی۔ اصول قانون۔ مبادی اخلاق۔ اور محاسن علم و عمل کی کوئی تعلیم اُس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم و حکمت کے سایہ دیوار تک کبھی اُس کا گزر نہیں ہوا۔ اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس سال پورے کرتا ہی۔ کہ دفعتاً غارِ حرا کے وہاں سے اُجالا ہوتا ہی۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرسبز اہلنا ہی۔ ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہی۔ صحف انبیاء اور اذکار عالیہ کے اوراق اُس کی زبان پر جاری ہوئے ہیں اُس کے پر تو صحبت سے اُمی اور جاہل علمائے دہرا اور دانشوران روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں۔ اصول قانون۔ مبادی اخلاق۔ اور محاسن علم و عمل کی تعلیم کا غلتا اُس کے بزم فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہی۔ کلام ربانی کے پر وہ ایں علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہوتے لگتے ہیں اس سے زیادہ قرآن مجید کے معجز ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہو؟

# پانچواں باب

## قرآن مجید کی پیشین گوئیاں

۱۔ قرآن مجید کی ایک سورہ کی برابر بھی کوئی دوسرا کلام کبھی پیش نہ کیا جاسکے گا۔  
سورہ بقرہ تیسرے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ  
وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ هَٰ فَإِنْ  
لَمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا (ترجمہ) اور وہ جو ہم نے اپنے بندے (محمد)

پر (قرآن) اتارا ہے اگر تم کو اس میں شک ہو (اور سمجھتے ہو کہ یہ کتاب خدا  
کی بنائی ہوئی نہیں بلکہ آدمی کی بنائی ہوئی ہے) اور اپنے اس معوسے  
(میں) سچے ہو تو اس جیسی ایک سورہ (تم بھی) بنا لاؤ۔ اور اللہ کے سوا اپنے  
حامتیوں کو بھی بلاؤ۔ پس اگر (اسی بات بھی) نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے

اس آیت شریف کا آخری حصہ تاکیدی پیشین گوئی ہے جس میں  
نہایت وثوق کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن مجید کے کلام الہی  
ہونے میں شک کرتے ہیں وہ ہرگز اس جیسا تھوڑا سا کلام کبھی کبھی پیش  
نہ کر سکیں گے۔ رسول خدا صلعم اپنی پیغمبری اور قرآن مجید کے کلام الہی ہونے کے

جو بہت سے دلائل پیش فرمایا کرتے تھے ان میں پیشین گوئی سب سے زیادہ  
 مستحکم دلیل تھی۔ ایک آن پڑھ پیغمبر کا مدعیان فصاحت و بلاغت سے پکار پکار کر  
 یہ کہنا کہ تم لوگ ہرگز ایسا کلام نہ لاسکو گے بڑی وقیع پیشین گوئی تھی جو  
 صحیح ثابت ہوئی اور تمام فصحا و بلغاء سے عرب اس جیسا کلام پیش کرنے سے  
 عاجز رہے اور اپنے سکوت سے اپنے عجز کا صاف اعتراف کر لیا۔

۲۔ حفاظت کلام الہی کی پیشین گوئی۔

سورہ آلحج کے پہلے رکوع میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ  
 وَاِنَّا لَآلِهَ لْخٰفِظُوْنَ ہ (ترجمہ) بیشک ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور بیشک  
 ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔

حفاظت قرآن سے صاف یہ مراد ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی اور تغیر  
 تبدیل نہ ہو سکے گا۔ قرآن مجید کے حق میں یہ ایک کھلی ہوئی پیشین گوئی ہے  
 اور کسی عمدہ طور پر پوری ہو رہی ہے۔ خدا نے اپنے کلام کی حفاظت کا ایسا مستحکم  
 انتظام فرمایا ہے جس کو قرآن کا معجزہ کہنا چاہیے کہ ہر ایک زمانہ میں ہزاروں  
 لاکھوں مسلمانوں کو قرآن حفظ کرنے کا شوق رہا۔ اور اب بلا مبالغہ یہ کیفیت  
 ہے کہ اگر خدا نخواستہ تمام روئے زمین سے مکتوبی قرآن معدوم ہو جائیں تو  
 کوئی قطعہ زمین ایسا نہیں ہے جہاں حافظ قرآن نہ ہوں اور ان کی یادداشت  
 سے قرآن نہ لکھ لیا جائے اور کسی حالت میں قرآن کا ایک جملہ ایک لفظ

بلکہ ایک حرف بھی نہ ضایع ہو سکتا ہے۔ نہ بدلا جاسکتا ہے۔ اور جس قدر قرآن مختلف  
 قطعات زمین میں اس طرح لکھے جائیں گے ان میں باہم زبرد بر کا بھی  
 فرق نہ ہوگا۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی صداقت دشمنوں تک کو مسلم ہے  
 اور جس کی کبھی اور کسی طرف سے تکذیب نہیں ہوئی۔

چنانچہ مسرولیم مسویر اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک  
 ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس (قرآن مجید)  
 کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو! نیز واقعات  
 اس کے شاہد ہیں کہ اس کتاب کے پہلے دن سے لکھے جا کر بکثرت نسخے ہر قوم  
 اور ملک میں ضایع ہوئے اور آخر کار مشرق سے مغرب تک پھیل گئے ان  
 ہزار ہزار قدیم ترین نسخوں میں ایک بھی نسخہ ایسا نہیں ملا اور نہ کبھی مل سکے گا  
 جس میں ایک حرف یا زبرد بر کا فرق ہو۔

۳۔ کفار عرب کی شکست اور مسلمانوں کے غلبہ کی پیشین گوئیاں

(الف) وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ صَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُدْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ  
 وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِبِينَ  
 لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيًا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝  
 لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَجُوهُ اللَّهِ وَإِنَّ لِلَّهِ  
 وَاسِعٌ عَلَيْهِمْ ۝ (سورہ بقرہ رکوع ۱۳)

(ترجمہ) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں (جن میں مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ بھی شامل ہے) خدا کا نام لیے جانے کو منع کرے اور ان کی بے رونقی کے ورپڑے۔ یہ لوگ خود اس لائق نہیں کہ مسجدوں میں آنے پائیں مگر ڈرتے ڈرتے ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بھی بڑا بھاری عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کا ہے پورب اور چھم تو جہاں کہیں (قبلہ کی طرف) منہ کر لو ادھر ہی کو اللہ کا سامنا ہو۔ بے شک اللہ بڑی کنجائش والا اور سب کچھ جانتا ہے۔

تاریخ اس کی شاہد ہے کہ ابتدائے اسلام میں پیغمبر صاحب اور ان کے چند متبعین جو اس وقت تھے خانہ کعبہ میں کفار اذان دینے اور نماز پڑھنے سے مانع ہوتے تھے۔ پیغمبر صاحب کے راستہ میں کانٹے انھوں نے بچھائے۔ پیغمبر صاحب نماز پڑھ رہے ہیں زبردستی آکر لپٹ پڑے اور گلا گھونٹا۔ ایک بار سجدہ میں تھے کہ اونٹ کی اوچھڑی گردن پر رکھی اور معمولی تکالیف تو آئے دن ہوتی رہتی تھیں۔ باوجودیکہ پیغمبر صاحب مسلمانوں کے ساتھ مکہ چھوڑ کر مدینہ جا بسے تھے اور ہجرت کے چھٹے برس عمرہ کرنے کے لیے مکہ جانا چاہا کہ وہ بھی ایک قسم کا حج تھا۔ مکہ والوں نے آپ کو اور آپ کے ہمراہیوں کو مکہ میں نہ آنے دیا۔ اس آیت میں کفار کے ان ہی مظالم کی طرف اشارہ ہے اور وہ جو پیشین گوئی کی تھی سو پوری ہو کر رہی۔ کہ انجام کا

خانہ خدا پر مسلمان قابض ہو گئے اور کفار مارے ڈر کے بھاگے بھاگے پھرنے لگے۔

کفار جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے یا آنے سے منع کرتے تھے تو اس سے مسلمانوں کو ضرور بے دلی ہوئی ہوگی کہ خانہ خدا میں ہم عبادت نہیں کر سکتے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اس چند روزہ روک ٹوک سے تم کیوں بددل ہوتے ہو۔ نماز کچھ خانہ کعبہ پر ہی موقوف نہیں جہاں چاہے خدا کی عبادت کرو۔ تمام روئے زمین مسلمانوں کے لیے مسجد ہے کہیں بھی ہو قبلہ کی طرف نماز پڑھ لو۔ خدا قبول کرنا ہے۔

جس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں اس وقت دشمنان اسلام کے دہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آگے چل کر ان کی طاقت اور قوت کا خاتمہ ہو کر وہ مغلوب اور مقہور ہو جائیں گے۔

(ب) قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سُدُخْلِبُونَ (ترجمہ) "اور پیغمبر! جو لوگ (دین اسلام سے) منکر ہیں ان سے کہہ دو کہ کوئی دن جاتا ہے کہ (مسلمانوں کے مقابلہ میں) تم مغلوب ہو گے" (سورہ آل عمران رکوع ۲) پیشین گوئی اس زمانہ کی ہے کہ ابھی نبی کریم کی جمعیت ملک عرب میں دشمنوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی اور مخالفت صرف مشرکین عرب ہی کی طرف سے نہ تھی بلکہ اندرونی مخالف منافق اور بیرونی مخالف عرب کے سب مشرک اور یہود و نصاریٰ اسلام کی



مخالفت پر کمر بستہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیشین گوئی کرنا اور اس پیشین گوئی کا آنحضرت صلعم کے سامنے پورا ہونا اسلام کی صداقت کا حکمتا ہوا نشان ہے۔

(ج) لَنْ يَنْصُرُوَكُمْ بِالْاَزْمِ وَاَنْ يَّقَاتِلُوَكُمْ يُؤَلُّوكُمْ الْاَوَّلِيْنَ ثُمَّ لَا يَنْصُرُوْنَ هُ صِرَبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ (سورہ آل عمران رکوع ۱۲)

ترجمہ ”مسلمانوں معمولی (ایذا دہی کے سوا وہ ہرگز تم کو کسی طرح کا (کوئی بڑا) نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ اور اگر تم سے لڑیں گے تو ان کو تم سے پیٹھ پھرتے ہی بن پڑے گی پھر (یہ بھی) اطمینان رکھو کہ ان کو (کہیں سے) مدد بھی نہیں ملے گی۔ جہاں دیکھو ذلت ان (کے سر) پر سوار ہے۔“

(د) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمْ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ

مُؤْمِنِينَ ۵ (سورہ آل عمران کوع ۱۳)

ترجمہ ”اور ہمت نہ ہارو اور اس اتفاقاً شکست سے (آرزوہ خاطر نہ ہو اور اگر تم سچے) مسلمان ہو تو (آخر کار) تمہارا ہی بول بالا ہے۔“

جنگ احد میں ستر مسلمان شہید ہو گئے تھے اور بہت سی تکلیفیں ان کو پہنچیں۔ اور یہ امر طبائع میں کچھ سستی اور کمزوری پیدا کر سکتا تھا۔ اس سے مسلمانوں کو غم بھی پہنچا تھا تو تقویت کے لئے فرمایا کہ جو وعدے تمہارے غلبہ کے ہیں وہ تو سچ ہو کر رہیں گے کیونکہ تم مومن ہو۔ اور ہلاکت کافروں کا

انجام ہی نہ کہ مومنوں کا۔

(۵) سُنَانِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا وَالرُّعْبُ (سورہ آل عمران)

(رکوع ۱۶)

ترجمہ ”گھبراؤ نہیں کہ ہم عنقریب تمہاری ہیبت کافروں کے دلوں میں  
بٹھا کر رہیں گے اُحد کے میدان میں باوجود مسلمانوں کو اس قدر نقصان  
پہنچانے کے کفار مسلمانوں سے مرعوب رہے۔ اُن کو معلوم تھا کہ آنحضرتؐ  
زندہ ہیں۔ ابو بکرؓ اور عمرؓ بھی زندہ ہیں۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان  
آنحضرتؐ کے گرد جمع ہو گئے تو اُس نے بہتری اسی میں دیکھی کہ فوراً مکہ کی  
راہ لی۔ راستہ میں اُن کو اپنی اس حرکت پر ندامت بھی ہوئی کہ ہم بغیر  
قطع قمع کیے کیوں میدان چھوڑ آئے۔ مگر بوجہ رعب کے لوٹ نہ سکے بلکہ  
الٹا نبی کریمؐ نے اُن کا حمار الاسد تعاقب کیا۔

(سورہ فطیٰ اللہ اَنْ يَّاتِيَا بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِنْ عِنْدِهَا فَيُصْبِحُوا  
عَلَى مَا اَسْرَوْا فِي اَنْفُسِهِمْ نَدِمِينَ) (سورہ باندہ رکوع ۸)

ترجمہ ”سو کوئی دن جاتا ہو کہ اللہ (مسلمانوں کی) فتح یا اور کوئی امر اپنی  
طرف سے پیش لائے گا تو اُس وقت یہ منافق (بدگمانی) پر جو اسلام  
کے غلبے اور اُس کی صداقت کی نسبت) اپنے دل چھپاتے تھے پشیمان  
ہوں گے، منافقین مدینہ اس خوف سے کہ مسلمان بوجہ اپنی قلیل تعداد کے

مغلوب ہوں گے۔ یہودیوں اور کفار سے خفیہ تعلقات رکھتے تھے کہ ہم کسی طرح بچ جائیں۔

(ط) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ

(سورہ انفال رکوع ۴)

ترجمہ: اس میں شک نہیں کہ یہ کافر اپنے مال (اس لیے) خرچ کرتے رہتے ہیں تاکہ (لوگوں کو) راہ خدا سے روکیں سو یہ لوگ تو مال کو (اسی طرح) خرچ کرتے رہیں گے مگر پھر (آخر کار وہی مال) ان کے حق میں (موجب) حسرت ہوگا (خرچ بھی کریں گے اور) پھر مغلوب بھی ہوں گے۔

(ی) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَاسْبَقُوا إِدْرَانَهُمْ وَلَا يَحْزَنُونَ

(سورہ انفال رکوع ۸)

ترجمہ: اور کافر یہ نہ سمجھیں کہ (ہمارے قابو سے) نکل گئے۔ وہ ہرگز (ہم کو) ہرا نہیں سکتے۔ یعنی کفر اسلام پر غالب نہیں آسکتا۔

(ک) وَ مِمَّنْ حَوْكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنْفِقُونَ ط وَ مِمَّنْ أَهْلُ الْمَدِينَةِ صَرَدُوا عَلَى الْإِنْفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَهُمْ سَاعِدًا بِهِمْ مَّرْتَانٍ (سورہ توبہ رکوع ۱۳)

ترجمہ: اور (مسلمانوں) تمہارے آس پاس کے دیہاتیوں میں سے (سب سے)

منافق ہیں اور خود مدینہ کے رہنے والوں میں سے بھی جو نفاق پر اٹھے بیٹھے ہیں (ایسی پیغمبر) تم ان کو نہیں جانتے ہم ان کو خوب جانتے ہیں سو ابھی تو ہم (دنیا میں) ان کو دہری مار دیں گے۔“

آپ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو بعض لوگ منافق تھے۔ بظاہر ملے رہتے تھے باطن کفار کے شرکاء تھے آنحضرت کو ان کے نام بتلا دیئے گئے۔ اور حضرت نے خطبہ میں ان منافقوں کے نام لے لے کر مسجد سے نکال دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تو مسلمانوں کی نظر سے بے اعتبار ہوئے۔ اور جب درپردہ کافروں کا ساتھ دیا تو کفار مغلوب ہو گئے غرض منافقین کی وہی حالت ہوئی۔ ازیں سورہ اندہ و ازلہ درماندہ دوہری مار سے غالباً یہی مطلب ہے۔

۱) وَالَّذِينَ هَاجَرُوا إِلَى اللَّهِ مِنَ بَعْدِ مَا ظَلَمُوا لَهُمْ  
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ط (سورہ نحل رکوع ۶)

ترجمہ اور جن مسلمانوں پر کافروں کی طرف سے ظلم ہوئے اور ظلم ہوئے پیچھے ان کو خدا کے لیے اپنے وطن چھوڑنے پر ہم ان کو ضرور ضرور دنیا میں اچھے ٹھکانے سے بھائیگی۔

مسلمانوں کے غلبہ کی پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی یہ بھی ہے جس کا وقوع ہو چکا۔ اس آیت میں جو ہجرت کا ذکر ہے تو اس میں

دو نوں ہجرتوں کی طرف اشارہ سمجھنا چاہیے پہلی ہجرت جو ملک حبش کی طرف ہوئی اور دوسری ہجرت مدینہ کی طرف ہوئی۔ مدینہ کی ہجرت بھی نبی کریم کے مکہ کی موجودگی ہی میں شروع ہو گئی تھی اور آپ نے سب سے آخر میں ہجرت کی۔ ان لوگوں کو جو اس بے سرو سامانی کے ساتھ اپنے گھر وں سے نکلے اور جن کی کوئی بڑی تعداد نہ تھی اتنی بڑی بشارت کہ انھیں ہم دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے۔ قرآن کریم کی ان بے نظیر پیشین گوئیوں میں سے ایک ہجرت کے سامنے سخت سے سخت مخالفت کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ کی صورت ہے۔ مکہ میں یہ اعلان ہوتا ہے اور ان لوگوں کے متعلق جو کس مہتری کی حالت میں کفار کے ہاتھ سے دکھ اٹھا کر بھاگے جا رہے ہیں۔ یہ آواز بلند ان کے مخالفین کو سنا یا جاتا ہے کہ ان کا اتصال نہیں ہوگا جیسا کہ تم نے گمان کر لیا ہے بلکہ ان کو دنیا میں بھی بلند مقامات عطا ہوں گے۔ سارا ملک چند نفوس کے اتصال کے در پی تھا۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ یہی چند نفوس اس دنیا میں بھی اعلیٰ مقامات پر پہنچیں گے۔ اس قسم کی پیشین گوئیوں نے ملک عرب کو آنحضرت کے سامنے جھکا دیا۔

قرآن مجید کی جس قدر پیشین گوئیاں اوپر مذکور ہوئیں یہ سب اس وقت ہوئیں جب مسلمانوں کی تعداد بہت کھٹوڑی تھی اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے

کسی کو مسلمانوں کے غلبہ کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب ہر طرف سے کفار کا ہجوم تھا اور مسلمانوں کا مختصر گروہ بے کسی کی حالت میں تھا تو اپنی کثرت اور قوت کے بھروسہ پر کفار کو یقین تھا کہ ہم تمام مسلمانوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ پیرہ چوہہ برس تک مسلسل مسلمانوں کو ستاتے رہے۔ ان کو طرح طرح کی ایذا میں اور تکلیفیں دیں اور مسلمان یہ تمام ایذا میں اور تکلیفیں اور بے آبروئی اور بے حرمتی کی سختیاں برداشت کرتے رہے اور ان کی تسلی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی معرفت بار بار یہ اعلان کیا کہ عنقریب خود مسلمان تمام عرب قبائل کی مخالفتانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ پیناچہ آنحضرت صلعم کے قلیل زمانہ قیام مدینہ میں قرآن مجید کی یہ سب پیشین گوئیاں پوری ہوئیں۔ کفار کو شکستوں پر شکستیں اٹھانی پڑیں۔ اسلام اور مسلمانوں کو غلبہ ہوا۔ اور آپ ہی کی زندگی میں سارے ملک عرب میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔ اور کفر و بت پرستی اپنی تمام برائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔

یہ پیشین گوئیاں نجومیوں رمالوں اور چوتھنیوں کی پیشین گوئیوں کی طرح گول مول اور مبہم الفاظ میں نہ تھیں بلکہ کھلے کھلے الفاظ میں مسلمانوں کو صاف صاف اطمینان دلایا گیا تھا کہ کوئی دن جاتا ہے کفار مغلوب ہوں گے اور مسلمانوں کا غلبہ ہوگا۔ تاریخ اور واقعات شاہد ہیں اور ساری دنیا جانتی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ سارا عرب ان کی دشمنی پر تلا ہوا تھا۔ اور

وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا نام و نشان دنیا سے مٹا دیں آغاز نبوت کے بعد آنحضرت کا قیام مکہ میں تیرہ برس رہا۔ مدینہ شریف پہنچ کر دو دوسرے سال ہجری میں سب سے پہلے جنگ بدر پیش آتی ہے۔ مکہ سے ایک ہزار سے زیادہ کی تعداد میں مسلح ہو کر کفار اپنے بڑے بڑے سرداروں کی سرکردگی میں یمن پر چڑھائی کرتے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ میدان میں لائی جاسکی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی یہی کل کائنات تھی۔ ان کے پاس نہ سواری کے لیے کافی اونٹ تھے نہ لڑنے کے لیے پورے ہتھیار نہ رسد کا سامان۔ مگر تائید ایزدی ان کے شامل حال تھی۔ اسی زمانہ سے غلبہ اسلام کی پیشین گوئیاں پوری ہونا شروع ہو گئیں۔ مسلمانوں کو شروع ہی سے ان الہامی پیشین گوئیوں پر کامل اعتماد اور یقین تھا۔ انہیں بشارتوں نے ان کے دل قوی اور ارادے مضبوط رکھے۔ جو شخص ایک بار اسلام قبول کر لیتا تھا پھر اس کو وحی اور الہامی خبروں پر پورا یقین ہوتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ باوجود گونا گوں مصائب کے ان کے قدم کبھی نہ ڈگکائے اور وہ ہمت اور استقلال کے ساتھ غلبہ اسلام کے منتظر رہے۔

۴۔ فتح بدر کی پیشین گوئی۔ ہجرت کے بعد قریش کو ہمت نہ ملے گی  
 اَمْ يَقُولُونَ كُنْ جَمِيعًا وَهُمْ يَكْفُرُونَ  
 سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ

الدَّابُّرُ ۵ (سورۃ القمر - رکوع ۳)

ترجمہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری بڑی قومی جماعت ہو سو کوئی دن جاتا ہے کہ (ان کا) گروہ شکست کھائے گا۔ اور (مسلمانوں کے مقابلہ میں) پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگیں گے۔ یہ آیت مکہ میں نبوت کے پانچویں چھٹے سال نازل ہوئی جو آنحضرت کی تبلیغ کا ابھی بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ اُس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ آسکتا تھا کہ رسول خدا کے ساتھ کبھی اس قدر جمعیت ہوگی کہ وہ کفار کے مقابلہ میں جنگ کو نکلیں گے اور کفار کے لشکر کثیر کو جو سب ایک دوسرے کی مدد پر تلے ہوئے تھے شکست دے سکیں گے۔

ایسی حالت میں جبکہ مسلمانوں کی کوئی بات بھی سننے والا نہ تھا یہ کھلی ہوئی پیشین گوئی کہ مسلمانوں اور کفار میں جنگ ہوگی اور اس جنگ میں کفار شکست کھا جائیں گے اور پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگیں گے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور اس کے علم غیب کی گواہی دیتی ہے۔ آنحضرت نے جس بے سرو سامانی کے ساتھ ہجرت فرمائی تھی اُس حالت کو دیکھ کر کسی کے دل میں یہ خیال بھی نہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ بے خانماں قافلہ ایک دن مدینہ سے اس قدر طاقتور ہو کر نکلے گا کہ جن لوگوں نے آغا نہ ہجرت تک ان کی جان لینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی وہ اُس کے ہاتھوں خود ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ لیکن قرآن مجید دوسری پیشین گوئی کر رہا تھا



چنانچہ پیشین گوئی حروف بہ حروف پوری ہوئی۔ اور ہجرت کے بعد ایک ہی سال کے اندر غزوہ بدر نے سرداران قریش کا خاتمہ کر دیا اور ان کے نامی سردار مارے گئے۔ اور اہل عرب کی مخالفت کی جرکت گئی۔

صحیح بخاری میں منقول ہے کہ رسول خدا بدر کے دن خیمہ میں تھے اور ختم

وہا کے بعد جب آپ باہر تشریف لائے تو زہرہ پہنے ہوئے تھے اور آپ

یہ آیت پڑھ رہے تھے سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ حضرت

عمر فرماتے ہیں کہ اس وقت میں سمجھا کہ اس آیت میں آج (غزوہ بدر) کی

فتح کی پیشین گوئی ہے۔ چنانچہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔ اس جنگ میں کفر و

اسلام ہی کا مقابلہ نہ تھا بلکہ عزیزوں۔ دوستوں۔ باپ اور بھائی یا مو

اور چچا کے خلاف تلوار اٹھانی تھی مسلمان اس امتحان میں پورے اتنے

اور اللہ اور اللہ کے رسول کے مقابلہ میں انہوں نے کسی کی پروا نہیں

کی۔ اللہ کی شان کہ تین سو آدمیوں کی چھوٹی سی بے سرو سامان جماعت

کو ایک ہزار بہادر سوراؤں کے مسلح لشکر پر ایسی زبردست فتح حاصل

ہوئی۔ قریش کا خیال تھا کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو دم بھر میں مسل کر رکھینگے

مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی ساری اکڑوں اور غرور کو مٹی میں ملا دیا۔

جَلَّ جَلَالُهُ

۵۔ مسلمانوں کو خلافت یعنی سلطنت عطا ہونے کی پیشین گوئی۔  
 وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ  
 فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَا يُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ  
 الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أُمَّنًا  
 يُعْبُدُونََنِي وَلَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (سورہ النور - رکوع ۷)

ترجمہ ”تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے ہیں۔  
 اُن سے خدا کا وعدہ ہے کہ (ایک نہ ایک دن) اُن کو ملک کی خلافت  
 (یعنی سلطنت) ضرور عنایت کرے گا۔ جیسے اُن لوگوں کو خلافت عنایت  
 کی تھی جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اور جس دین کو اُس نے ان کے  
 لیے پسند کیا ہے (یعنی اسلام) اُس کو ان کے لیے جما کر رہے گا۔ اور خوف  
 و خطر جو ان کو (لاحق) ہے اس کے بعد (عنقریب ہی) ان کو (اُس کے)  
 بدلے میں امن دے گا (کہ باطمینان) ہماری عبادت کیا کریں گے اور  
 کسی چیز کو ہمارا شریک نہ گردانیں گے۔“

ایسی صاف اور مستحکم پیشین گوئی پیغمبر صاحب کی نبوت کی بڑی  
 قوی دلیلوں میں سے ہے اُس کو پورا ہوتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھ لیا۔  
 اس کی تصدیق کے لیے کسی ثبوت اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس آیت  
 میں تین وعدے صراحت کے ساتھ کیے گئے ہیں اول وعدہ خلافت یعنی

سلطنت۔ دو مہینے تک دین۔ سوم خوف کی جگہ امن قائم کر دینا سیاق عبارت سے دوام خلافت مستند ہوتا ہے۔ یعنی بادشاہت مسلمانوں میں ہمیشہ رہے گی۔ بادشاہت میں ملک عرب کی بادشاہت تو امر لازم ہے اور اس لیے کہ وہ بادشاہت نبی کریم کو ملی۔ لہذا ضرور ہو کہ وہ مسلمانوں میں رہے۔ نیز دین اسلام کے قیام اور تکمیل کے لیے اور اس کے ارکان کی حفاظت کے لیے بھی اس ملک کی بادشاہت کا مسلمانوں کے پاس رہنا ناگزیر ہے۔  
وعدہ اپنی سچا ہے۔

تکمیل دین سے مراد دین کو ایسا مضبوط کر دینا کہ کوئی طاقت اس کو برباد نہ کر سکے۔

مسلمانوں کا گروہ ایک مظالم بھیس اور ضعیف گروہ تھا جس کو کفار مکہ نے طرح طرح کی آدیتیں دے کر خانماں برباد کر دیا تھا۔ اس نے مدینہ میں آکر خدا کے نیک بندوں کے سایہ میں پناہ لی تھی۔ یہاں آکر بھی اس کو اطمینان اور راحت کی نیند نصیب نہ ہوئی۔ کفار مکہ تو پہلے ہی سے خون کے پیاسے تھے۔ مدینہ میں آکر دشمنوں کی تعداد میں منافقین اور یہود کا اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کو ہمیشہ کفار کے حملے کا خوف لگا رہتا تھا۔ اور ذرا سے شور و غل پر مدینہ میں چوہی پھیل جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صحابہ سوئے جاگتے مسلح رہتے تھے۔

چنانچہ اس مظلوم گروہ نے اس حالت سے تنگ آ کر ایک دن رسول خدا سے عرض کیا کہ ہم کو دن رات ہتھیار بند رہنا پڑتا ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی آئے گا جب ہم کو اطمینان حاصل ہوگا۔ اور خدا کے سوا اور کسی کا ڈرنہ ہوگا۔ اس پر ان کو خدا نے قرآن مجید میں خلافت ارض یعنی دینی اور دنیاوی شہنشاہی کی بشارت دی اور وہ پوری ہوئی۔ اسلام کو استحکام میسر ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے خوف کی جگہ امن کر دیا۔ اس ضعیف گروہ نے آگے چل کر دنیا پر اس طرح کی کامیاب حکومت کی کہ اس کے سامنے متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر گیا۔

یہ بشارت عظیمی واقعات اور حالات گرد و پیش کے لحاظ سے کس قدر ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ مگر چند ہی سال میں مجال نے وقوع کی صورت اختیار کر لی۔

گو بیٹھے ایک مشہور جرمن فاضل نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

”اس کتاب (قرآن) کی اعانت سے عربوں نے سکندر اعظم کے جہان سے بڑا جہان اور رومنہ اکبری کی سلطنت سے وسیع تر سلطنت فتح کر لی اور جس قدر زمانہ کہ سلطنت روما کو اپنی فتوحات کے حاصل کرنے میں درکار ہوا تھا اس کا دسواں

حصہ بھی ان کو نہ لگا

فتح مکہ کی پیشین گوئی

فَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبُهُمُ اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْرِجُهُمْ وَيُنْصِرْكُمْ عَلَيْهِمْ  
وَيَشْفِ صُدُوقَهُمْ مُؤْمِنِينَ هُوَ وَيَذْهَبُ عِنْتَ قُلُوبِهِمْ

(سورہ التوبہ رکوع ۲)

ترجمہ: ان لوگوں سے بے تامل لڑو۔ خدا تمہارے ہی ہاتھوں ان کو سزا دے گا۔ اور ان کو رسوا کرے گا اور ان پر تم کو فتح دے گا۔ اور مسلمانوں کے گروہ کے کابجوں کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں میں جو (کافروں کی طرف سے) غصہ (بھرا ہوا) ہے اس کی خلش کو بھی دور کر دے گا

اس سورہ میں اس آیت سے پیشتر صلح حدیبیہ اور اس معاہدہ کا

ذکر ہے جو کفار مکہ اور مسلمانوں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ صلح فتح مکہ سے تین سال پیشتر کفار قریش اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھی جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ نیز کفار کی معاہدہ شکنی کا ذکر ہے جس کا نتیجہ جنگ ہوا اور مسلمانوں کو فتح عظیم نصیب ہوئی اور مکہ فتح ہو گیا۔ یہ پیشین گوئی جو اوپر نقل ہوئی اسی تذکرہ کے سلسلہ میں ہے لہذا یہ آیت بالاتفاق فتح مکہ کی پیشین گوئی تسلیم کی جاتی ہے۔

مسلمانوں کو فتح مکہ کی لو لگی ہوئی تھی یعنی اُس شہر پر قبضہ جہاں سے وہ نہایت بے بسی اور بے بسی کے عالم میں نکلے تھے اور جس کے حدود میں اُن کو قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ گواہ مدینہ میں مقیم تھے مگر وطن کی یاد دلوں سے کم نہ ہوتی تھی۔ اُن کو فتح پر فتح ہوتی علی جا رہی تھی لیکن اُن کے دل کی کلی اپنی اشکستگی کے لیے جس موسم بہار کا انتظار کر رہی تھی وہ ہنوز نگاہوں سے دور تھا۔ مگر بشارت الہی قدم قدم پر اُن کی تسکین کے لیے نیا پیام لا رہی تھی اور مزہ فتح سے اُن کو شاد کرتی جاتی تھی۔

چنانچہ سورہ صاف میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بشارت دی تھی۔  
 وَأَخْرَجُوا جَبُونَهَا نَصْرًا مِنَ اللَّهِ وَفَتْحًا قَرِيبًا وَكَثِيرًا أَلْمِينِينَ  
 (سورہ الصاف رکوع ۲۴)

ترجمہ ”(ایک اور نعمت بھی) اور جس کو تم (دل سے) پسند کرتے ہو کہ خدا کی طرف سے (تم کو) مدد (ملے گی) اور تم عنقریب فتح پاؤ گے اور (ای پیغمبر) مسلمانوں کو (اس کی) خوشخبری سنا دو“

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ سُرُورَهُ الشُّرَّاءُ بِالْحَقِّ لَتَدَّ خُلُقَ  
 الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِنْ شَاءَ اللَّهُ آمِينَ خَلْقَيْنِ سَاءَ وَسَاءَ  
 وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ ط (سورہ الفتح رکوع ۴)

ترجمہ: بے شک اللہ نے اپنے رسول کو واقعی سچا ہی خواب دکھایا تھا کہ  
انشاء اللہ تم (مسلمان) مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں بے خوف و خطر باطمینان  
تمام داخل ہو گے (وہاں جا کر) تم (کچھ تو) اپنا سر منڈواؤ گے اور (کچھ فقط)  
بال ہی کتر واؤ گے۔

ہجرت کے چھٹے برس صلح حدیبیہ سے پہلے آنحضرتؐ نے خواب میں  
دیکھا کہ مسلمان مسجد حرام (خانہ کعبہ) میں گئے اور وہاں احرام اُتارنے کے  
لئے کوئی بیٹھا سر منڈوا رہا ہے اور کوئی بال کتر وا رہا ہے۔ اوپر کی آیت میں  
اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کے اسی خواب کا ذکر فرمایا ہے۔ چونکہ سر منڈوانا بال  
کتر وانا اعمال حج میں سے آخری عمل ہے تو خواب کا مطلب یہ ہوا کہ تم باطمینان  
تمام حج کرو گے۔ مسلمانوں کو مکہ سے نکلے ہوئے کوئی پھر برس ہو گئے تھے کچھ تو  
وطن کی یاد کیونکہ بعض صحابہ کے بال بچے ابھی تک وطن ہی میں تھے کچھ عزیز و  
کی محبت اور کچھ کعبہ کی زیارت کا شوق۔ غرض یہ لوگ مکہ جانے کے لئے بے چین تھے  
اُدھر انصار مدینہ بھی کافروں کے ڈرتے ہجرت کے بعد حج کو نہیں جاسکے  
تھے۔ وہ بھی اللہ کے گھر کی زیارت کے لئے بے تاب تھے۔ کچھ تو صحابہ کا یہ  
شوق اور بے تابی دیکھ کر اور کچھ اس خواب کی بنا پر آنحضرتؐ ذیقعدہ ۶  
کی پہلی تاریخ عمرہ (زیارت و طواف کعبہ) کے ارادہ سے مدینہ سے روانہ  
ہوئے اور حدیبیہ کے مقام پر پہنچے جو مکہ سے نو میل کے فاصلہ پر ہے۔

۱۴۰۰ چودہ سو کی تعداد میں مسلمان آپ کے ساتھ تھے۔ آپ نے قربانی کے لیے بہت سے اونٹ بھی ساتھ لے لیے تاکہ کافروں کو لڑائی کا شبہ نہ ہو۔ ہتھیاروں میں سوائے تلوار کے کوئی چیز ساتھ نہ تھی۔ کفار مکہ نے باوجود اس علم کے کہ سوائے زیارت و طواف بیت اللہ آپ کا اور کچھ منشا نہیں ہو حرم کی حد پر پہنچے ہوئے ۱۴۰ مسلمانوں کو داخلہ مکہ سے روک دیا لیکن جب قریش کو معلوم ہوا کہ مسلمان مارنے مارنے پر آمادہ ہیں تو امیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا۔ کافروں کا سب سے بڑا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمان اس سال حج نہ کریں آخر بڑی روکدک کے بعد صلح ہو گئی۔ اور صلح کی شرطیں یہ قرار پائیں (۱) مسلمان اس سال مکہ میں داخل نہ ہوں (۲) دوسرے سال آئیں اور صرف تین دن ٹھہر کر واپس چلے جائیں (۳) سوائے تلوار کے کوئی ہتھیار ساتھ نہ لائیں (۴) کوئی شخص کافر ہو یا مسلمان مدینہ سے مکہ آنا چاہے تو اجازت ہوگی مگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مکہ سے مدینہ نہ جاسکیگا (۵) تمام قبیلوں کو آزادی ہوگی کہ وہ خواہ مسلمانوں سے معاہدہ کریں یا کافروں سے۔

اس صلح سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے دب کر صلح کی ہے مسلمانوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کیا آپ نبی نہیں ہیں آپ نے فرمایا بے شک ہوں۔ حضرت عمر نے پوچھا کیا ہم حق پر ہیں۔ فرمایا



ہاں حق پر ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ پھر ہم دین کے معاملہ میں دب کر کیوں صلح کریں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا وہ خدا کے حکم کے مطابق ہوا۔

اس صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے مدینہ کی طرف واپسی کا قصد فرمایا۔ صلح کے کے دو روز بعد یہ آیت نازل ہوئی اَنَا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا (سورہ فتح رکوع ۱) یعنی ہم نے کھلی فتح تم کو دی۔ آپ نے اسی وقت حضرت عمرؓ کو بلوا کر یہ خوشخبری سنائی جس سے مسلمانوں کے سارے غم اور پریشانیاں دور ہو گئیں۔ اور دو برس بعد مکہ فتح ہو گیا۔ تمام مفسرین کی بالاتفاق رائے ہے کہ یہ فتح مکہ کی بشارت ہے۔ جس کا آگے چل کر ظہور ہوا اس فتح کے مسلمان سب سے زیادہ منتظر تھے اس کے بعد سورہ توبہ میں جو مدینہ شریف میں سب سے آخر نازل ہوئی ارشاد ہوا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ  
الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا (سورہ توبہ رکوع ۴)

ترجمہ: مسلمانو! مشرک تو (نرے) گندے ہیں تو اس برس کے بعد حرمت والی مسجد (خانہ کعبہ) کے پاس بھی نہ پھٹکنے پائیں گے! اس سے زیادہ صاف اور کیا پیشین گوئی ہو سکتی ہو چنانچہ اگلے سال مکہ فتح ہو گیا۔

مکہ میں داخلہ کے بعد آپ نے سب سے پہلے خانہ کعبہ کو تین سو ساٹھ

بٹوں کی نجاست سے پاک کیا اور تمام ہت نکلوا کر پھینکا دیا۔ اور دیواروں پر جو انبیاء اور رسولوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں انھیں مٹا دیا۔ جب پوری صفائی ہو گئی تو آپ نے نماز پڑھی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے وعدہ کے مطابق مسلمانوں کو اپنے گھر پر قبضہ دلا دیا۔ جو اس کے صحیح عہدار تھے۔ مکہ میں آپ پندرہ دن ٹھہرے۔ اس عرصہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ اور خانہ کعبہ پر سے کفار کا قبضہ بالکل اٹھ گیا اور مذکورہ بالا قرآن مجید کی پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

### ۱۰۔ غلبہ روم کی پیشین گوئی

الْمَغْلِبَاتِ الرَّومِ فِي اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَلَيْهِمْ  
 سَيَخْلِبُونَ فِي بضع سنين ه لِّلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَرِ مِنْ بَعْدُ  
 وَيَوْمَئِذٍ يَفْسَحُ الْمَوْتُونَ بِنَصْرِ اللّٰهِ طَبَّصِرْ لِمَنْ يَشَاءُ وَهُوَ  
 الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ه وَعَدَ اللّٰهُ لَا يَخْلِفُ اللّٰهُ وَعَدَا ه (سورہ روم کوٹھ  
 ترجمہ۔ قریب کے ملک (یعنی عراق) میں رومی (جو نصاریٰ ہیں) اہل فارس  
 سے (جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہو گئے ہیں لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب  
 ہوئے چھپے عنقریب چند سال میں (پھر اہل فارس پر) غالب آ جائیں گے  
 (اس سے) پہلے بھی (فتح و شکست کا) اختیار اللہ ہی کو تھا اور (اس واقعہ

کے) بعد بھی (اُسی کو اختیار ہے) اور اُس دن (جبکہ رومی غالب ہو گئے) مسلمان اللہ کی مدد سے خوش ہو جائیں گے وہ جس کی چاہے مدد کرتا ہے اور وہ زبردست اور رحم والا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کیا کرتا،

اُدُنِ الْاٰخِرٰتِ کے لفظی معنی ہیں۔ قریب سرزمین کے۔ عرب کے شمال میں عرب سے ملحق شام و فلسطین کی سرزمین ہے اور مشرق میں عراق و فارس کے حدود عرب سے ملتے ہیں۔ عراق۔ شام اور فلسطین ہر قتل شاہ روم کے قبضہ میں تھے۔ ایرانی افواج نے عراق پر یورش کر کے دمشق اور بیت المقدس کو بھی فتح کر لیا اور صلیب مقدس کو لے گئے۔ یہ وہیوں (عیسائیوں) کی انتہائی مغلوبیت تھی۔

بِضَعِ سِنِيْنَ (چند سال) محاورہ عرب کے مطابق اس چند سال کی ميعاد تین سال سے نو سال تک ہے یعنی بضع سنين کی انتہائی ميعاد نو سال ہے۔

آنحضرت صلعم کے عہد میں مملکت روم (ایشیائے کوچک ملک شام و فلسطین و آرمینا وغیرہ) نصاریٰ کے قبضہ میں تھی اور شاہ روم ہرقل تھا۔ ملک فارس پر آتش پرست مسلط تھے اور خسرو ثانی بادشاہ تھا۔

رومیوں اور عیسائیوں میں لڑائی ہوئی۔ اگرچہ یہ لڑائی عراق میں شروع ہوئی تھی جو عرب سے خارج اور اس کی سرحد پر واقع ہے اور عرب کو اس جنگ سے کچھ تعلق نہ تھا مگر تاہم مسلمان چاہتے تھے کہ رومیوں کا غلبہ ہو کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ اور مشرکین عرب اہل فارس کی حیر مناتے تھے۔ کیونکہ وہ بھی ایک طرح کے بت پرست تھے۔ اتفاق سے اہل فارس کی فتح ہوئی تو مشرکین عرب بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں پر آوازے کسے لگے۔ ان آیتوں میں خدانے کئی سال پہلے بتا دیا کہ گو اس وقت رومی مغلوب ہو گئے ہیں مگر وہ چند سال بعد اہل فارس پر فتح پائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور یہ واقعہ تاریخی پیشین گوئی کا بڑا زبردست معجزہ ہے۔

دو زبردست سلطنتوں کے بارہ میں برسوں پہلے ایک قطعی فیصلہ وثوق کے ساتھ کروینا کسی بشر کا کام نہیں اور پیغمبر صاحب کو تو ان دونوں سلطنتوں کی فوجی قوت اور انتظام کے جانچنے کا بھی موقع ہی نہ ملا۔ اس پیشین گوئی کے مطابق جو وقت رومیوں کے ایرانیوں پر غلبہ پانے کا ہے وہی مسلمانوں کے اپنے دشمنوں پر غلبہ کا ہے۔ اور دونوں کو اکٹھا کرنے کی یہ وجہ ہے کہ اس پیشین گوئی کے وقت دونوں قومیں رومی اور مسلمان مغلوب تھیں اور مغلوب بھی ایسی کہ ان کے اٹھنے اور ایک طاقتور دشمن پر غالب آنے کا حقیقت سے خفیہ بھی قرینہ نہ تھا۔

یہ سورتہ بالاتفاق لگی ہوئی ہے۔ مگر اس کا نزول یقین کے ساتھ پانچواں سال نبوت ہی یہی وہ وقت ہے جبکہ رومیوں کی مغلوبیت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور اہل فارس نے ان کے تمام صوبے یکے بعد دیگرے فتح کر لیے تھے اس پیشین گوئی کے بعد آنحضرتؐ سات آٹھ سال مکہ میں رہے اور ایک سال مدینہ کے قیام کے بعد مسلمانوں کو بدر کی فتح نصیب ہوئی یہی وہ وقت تھا جب رومی از سر نو فارس پر غالب آئے سلطنتِ روم اور اہل فارس کا عرصہ سے مقابلہ چلا آتا تھا۔ ۶۰۲ء عیسوی میں وہ عظیم الشان جنگ چھڑ گئی جس کا اوپر کی آیت میں ذکر ہے۔ اور ۶۱۵ء عیسوی میں ایرانی جنرل نے دمشق اور یرشلیم کو فتح کیا اور رومی اس کا مقابلہ نہ کر سکے (شاہجہاں پیدیا برٹانیکا)

ایک ایسی لمبی جنگ کے بعد جو تیرہ سال جاری رہی سلطنتِ ایران سلطنتِ روم پر غالب آجاتی ہے۔ اس کا صوبہ پر صوبہ لیے چلی جاتی ہے یہاں تک کہ کل صوبجات کو لیکر دارالخلافہ کے دروازہ پر جا پہنچتی ہے ایسے وقت میں پیشین گوئی کہ مغلوب سلطنت زیادہ سے زیادہ نو سال میں غالب آجائے گی قیاس و قرائن کے سراسر خلاف تھی اسی پر بس نہیں بلکہ ساتھ ہی ایک بظاہر ایسی ناممکن الوقوع بات اور بتلادی کہ عین اسی وقت جبکہ رومی ایرانیوں پر نو سال کے اندر غالب آئینگے مسلمان بھی مشرکین پر

غالب آجائنگے۔ حالانکہ مسلمانوں کی اُس وقت کوئی جاعت بھی نہیں تھی جس کے غالب آنے کا وہم و گمان بھی کسی کو ہو سکے لیکن قدرت خدا وہی کا کرشمہ کہ ایک ہی سال یعنی ۶۲۴ء عیسوی میں ہرقل نہ صرف اپنے علاقے واپس لے لیتا بلکہ ایران کے اندر داخل ہو کر ان کے بڑے آتش کرے کو تباہ کر دیتا اور اسی سال ۳۱۳ء مسلمان جن کے پاس ہتھیار نہیں اور جو جنگ آزمودہ نہیں ایک ہزار قریش کی مسلح جمعیت پر غالب آجاتے ہیں (فتح بدر) (نوٹ ۶۱۵ء میں ایران نے روم پر فتح کامل پائی اور نو برس پورے نہ ہوئے تھے کہ ۶۲۲ء میں رومیوں نے ازسرنو فارس پر غلبہ پایا) ایسی عظیم الشان پیشین گوئی سن کر عرب خاموش نہ رہ سکتے تھے۔

ابی بن خلف نے شد و مد سے انکار کیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابو بکرؓ نے جن کا ایمان وحی پر پہاڑ کی طرح مضبوط تھا اس پر شرط لگائی کہ اگر تین سال میں اہل روم غالب نہ آئے تو دس اونٹ میں دو گنا اور اگر غالب آگئے تو دس اونٹ تم سے لو گنا۔ آنحضرتؐ کو جب یہ علم ہوا تو آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا کہ "بضع سنین" کا لفظ نو برس تک کے لئے آتا ہے۔ لہذا میعاد اور شرط دونوں بڑھا دو۔ ابی بن خلف نے اس کو منظور کر لیا اور شرط یہ بٹھری کہ اگر نو سال کے اندر رومیوں نے ایران کو مغلوب نہ کیا تو حضرت ابو بکرؓ ایک سو اونٹ ابی کو دیں ورنہ اُس سے ایک سو اونٹ لے لیں۔ چنانچہ

اعادیت میں مذکور ہے کہ جب پندرہ کا واقعہ ہوا تو رومی ایرانیوں پر غالب آگئے اور ابو بکر نے اپنی کے وارثوں سے حسب قرار داؤتواونٹ لے لئے اور آنحضرتؐ کے پاس لائے آپ نے ارشاد فرمایا کہ صدقہ کر دو۔ غرض یہ پیشین گوئی کفار میں بہت شہرت پائی تھی اور اس کا پورا ہونا بھی ان پر اچھی طرح ظاہر ہو گیا تھا۔ اس پیشین گوئی کے اس طرح پورے ہونے پر بہت سے قریش مسلمان ہو گئے۔ اس واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوال سلطنت روما کا مشہور مصنف ایڈورڈ کینن اس حیرت ناک پیشین گوئی کی صداقت سے متحیر ہو کر لکھتا ہے۔

”مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دونوں کی ایک دوسرے کو تباہ کرنے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا (آنحضرتؐ کی طرف اشارہ ہے) اور عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو پیہم کامیا بیاں حاصل ہو رہی تھیں اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح و ظفر رومی علم پر سایہ انگن ہوں گے۔ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہر قل کے بارہ سال یعنی سن ۶۱۲ء سے ۶۱۰ء تک کے حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ

جلد بکھر جائے گا۔“

(نوٹ یعنی ہر قل نہایت کاہل آرام طلب اور عیش پرست بادشاہ تھا جس کو انتظام سلطنت کی طرف بالکل توجہ نہ تھی لہذا بظاہر سب آثار زوال سلطنت کے تھے۔ مؤلف) تاریخ زوال روم جلد سوم صفحہ ۲۰۲)

آنحضرتؐ نے اپنی الہامی زبان میں جن واقعات کی پیشین گوئی کی جو ان سب میں سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ صاف و صریح اور سب سے زیادہ معرکہ آرا غلبہ روم کی پیشین گوئی تھی۔ یہ پیشین گوئی دنیا کا عظیم ترین معجزہ ہے۔ اپنی صفائی کے لحاظ سے آنحضرتؐ کا یہ معجزہ قیامت تک آپ کی رسالت کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے۔ **اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَصَحْبِهِ وَسَلَّمَ۔**





# چھٹا باب

## قرآن مجید کی تعلیم اور ہدایت

اس باب میں قرآن مجید کی معنوی خوبیوں اور باطنی کمالات کا ذکر ہو گا تاکہ معلوم ہو کہ اس کلام پاک نے بنی آدم کی روحانی اور خَلاتی تعلیم و تربیت اور اصلاح و ترقی تمدن میں کیا کیا کرشمے دکھائے اور کیسے دائمی اثر نتیجے پیدا کیئے جو اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ جس کلام کے وہ نتیجے پرشہ بے شک و شبہ کلام الہی ہی اور ممکن نہیں ہو کہ بغیر تائید وحی و الہام کے انسان ویسا کلام کر سکے جس کے نتیجے ایسے عظیم الشان اور دائمی اثر ہوں۔

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا دنیا ایک عجیب و وحانی سکتہ میں مبتلا تھی۔ توحید ذات و صفات باری تعالیٰ اور خالص خدا پرستی کو تقریباً سب لوگ بھولے ہوئے تھے۔ اور طرح طرح کے فاسد عقیدے اور غلط رائے اور باطل پرستیاں اختیار کر رکھی تھیں۔ کوئی خدا کے واحد کے مقابل دو وجود نور و ظلمت یا نیروان و اہرمن کو قایم کر کے نیکی اور بدی کے اختیارات ان میں تقسیم کرتا تھا۔ کوئی چاند اور سورج وغیرہ ستاروں کے نور و ضیا کا فریضہ تھا

اور ان کو نور خدا بلکہ خدا سمجھ کر ان کے آگے سر جھکاتا تھا۔ کوئی آتش پرستی میں سرگرم تھا اور آگ کو معبود حقیقی سمجھ کر اس سے لو لگائے ہوئے تھا کوئی پہاڑوں و دریاؤں اور پھیلوں کی محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی ان گھڑ پتھروں کو خدا سمجھ کر دنیا و آخرت کی توقع پر ان کے سامنے بیٹھتا ہی رہتا تھا۔ کوئی نیچر یعنی طبیعت ہی کو خالق اشیاء سمجھتا تھا اور خالق نیچر سے بے خبر اور اس کا منکر تھا۔ بعض قومیں جو خدا پرستی کا دم بھرتی تھیں اور اپنے کو خالص خدا کا بندہ بتلاتی تھیں ان کی حالت سب سے خراب تھی۔ چنانچہ یہودی جہاں جہاں پہنچے غیر قوموں کے مذہبی خیالات اور اعتقادات سے متاثر ہونے سے نہ بچ سکے۔ ان میں سے جو عرب پہنچا آباد ہوئے مشرکین مکہ کی بت پرستی نے ان پر ایسا اثر کیا کہ وہ انھیں کے رنگ میں رنگے گئے۔ یہ باور کرنے کے معقول وجوہ ہیں کہ کعبہ کی دیواروں پر جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور جن کو فتح مکہ کے دن آنحضرت کے حکم سے مٹایا گیا وہ سب یہودیوں کی بنائی ہوئی تھیں نیز خانہ کعبہ میں حضرت نوح حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی جو مورثیں موجود تھیں ان کا وجود بھی یہودیوں کے مذہب سے وابستہ تھا۔ عیسائیوں کے عقاید میں بھی فرق آگیا تھا حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بلکہ پورا خدا سمجھنے لگے۔ اور نہایت ذلیل بت پرستی نے خدا کے واحد کی اس سادہ پرستش کی جگہ چھین لی تھی جس کی حضرت عیسیٰ

نے ہدایت کی تھی۔ خلاصہ یہ کہ اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی اپنے مذہب کی بڑی اہل یعنی اللہ تعالیٰ کے خالص ستیش کو بھول گئے تھے۔ اور سو رہتھادی اور بعتوں کے لحاظ سے اپنے بت پرست معاصرین کے مساوی تھے عرب کی حالت سب سے بدتر تھی۔ وہ گویا سب ملکوں کی بے دینی کا نمونہ اور مجموعہ تھا۔ اور نہایت ناشائستہ اور ذلیل فسق و فجور اور اعلیٰ اور ہدنی پستی میں مبتلا تھا۔ مشرکین اور تمام اہل عرب ایک جاہل لٹیری اور خونخوار خانہ بدوش قوم تھی جس میں ذرا ذرا سی باتوں پر ہمیشہ خونریزیاں ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً وہ لڑائی جو اشعار عرب میں حرب بسوس کے نام سے مشہور ہے چالیس برس تک جاری رہی اور اس میں اول سے آخر تک شترنزار آدمی مارے گئے۔ اس کی بنیاد صرف یہ تھی کہ قبیلہ بنی تغلب میں بسوس نام ایک عورت تھی اس کے ایک ہمان کی اونٹنی قبیلہ بنی بکر کے ایک شخص کی چراگاہ میں چلی گئی اور اس شخص نے اس اونٹنی کے ٹھن کاٹ ڈالے۔ اس بات پر بنی تغلب اور بنی بکر دونوں قبیلوں میں لڑائی ٹھن گئی اور چالیس برس تک اس کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح ایک دوسری لڑائی جو حرب داحس کے نام سے مشہور ہے ۶۳۵ برس جاری رہی۔ اس کا سبب بھی صرف اتنی سی بات تھی کہ داحس نامی ایک گھوڑا گھڑوڑ میں آگے بڑھا چاہتا تھا کہ ایک شخص نے آگے بڑھ کے اس کو بدکا دیا۔ اس پر وہ رن پڑے

کہ قبیلے کے قبیلے پامال ہو گئے۔ کینہ و قساوت کا یہ حال تھا کہ عورتیں اپنے زخمی اور مقتول دشمنوں کا کلیجہ نکال کر دانتوں سے چباتیں اور ان کے ناک کان اور شرمگاہیں کاٹ کر ڈوسے میں پرو کر کمال بے شرمی سے ہار اور پہنچوں کی طرح گلے اور ہاتھوں میں ہنپتی تھکیں۔ چوری اور قزاقی میں ریگانہ تھے۔ سب سے زیادہ وحشیانہ اور ہولناک رسم جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ان میں یہ جاری تھی کہ معصوم بچوں کو فوج کر کے بتوں پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور غریب بے زبان لڑکیوں کو خسہر کہلانے کی شرم سے یا اغلاس کے ڈر سے کبھی تو پیدا ہوتے ہی ان کا گلا گھونٹ دیتے تھے۔ یا زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اور کبھی پہاڑ سے لڑھکا کر اور کبھی پانی میں ڈبو کر مار ڈالتے تھے۔ اور کبھی ذبح بھی کر ڈالتے تھے۔ لونڈیوں اور غلاموں کے ساتھ نہایت بدسلوکی سے پیش آتے تھے ان سے سخت سخت محنتیں کراتے تھے اور برے سے برا کھانا کھانے کو اور ناقص سے ناقص کپڑا پہننے کو دیتے تھے۔ عرض ان کے نزدیک لونڈی اور غلاموں کی حقیقت بھیڑ بکری سے زیادہ نہ تھی۔

حرام کاری۔ بے حیائی اور بے غیرتی کی یہ نوبت تھی کہ کنواری اور بیاہی عورتیں بدکاری پر فخر کرتی تھیں اور جس طرح مرد کسی نامی اور مشہور خاندان کی عورت سے بدکاری کر کے فخر کے طور پر بیان کرتا تھا اسی طرح عورتیں کسی نامور

اور مشہور خاندان کے مرد سے بدکاری کر کے فخریہ اُس کا اعلان کیا کرتی تھیں  
شاعر اپنے اشعار اور قصیدوں میں دولت مند اور امیروں کی لڑکیوں بہنوں اور  
بیویوں کے نام لے لے کر بیان کرتے اور ہر طرح کے عیبوں اور بُرائیوں کو اُن  
سے منسوب کرتے۔ لوندیوں کو اس لیے گانا بجانا سکھایا جاتا تھا کہ وہ بدکاری  
کے ذریعہ سے اپنے آقاؤں کے لیے مال و دولت کمائیں۔

مرد پوڑے کے پوڑے بیویوں کے رکھتے تھے جن میں بلا تکلف باپ کی منگولہ  
عورتیں بھی بطور میراث کے شامل ہوتی تھیں۔ طلاق کی رسم کا بہت ہی بے  
طریقہ سے اُن میں رواج تھا۔ یعنی مرد طلاق کے بعد بھی عورت کا پیچھا نہ  
چھوڑتے تھے۔ طلاق کے بعد عورت کو ایک مہینہ تک نکاح ثانی کی مجاز نہ  
تھی مگر مرد اس کو پھر اپنی زوجیت میں لے لیتا تھا۔ اور پھر طلاق دے دیتا  
تھا۔ اور اس بار بار کی طلاق اور رجعت سے کبھی تو یہ غرض ہوتی تھی کہ عورت  
کسی دوسرے مرد سے ازدواج نہ کرے جو شوہر سابق کی ذلت کا باعث ہو  
اور کبھی یہ کہ بچاری تنگ اور مجبور ہو کر اپنے حق مہر سے دست بردار ہو جائے۔  
غرض عورتوں کو کسی قسم کی آزادی اور حقوق حاصل نہ تھے۔ اور وہ فی الواقع  
نہایت ذلیل اور سست حالت میں تھیں۔

یتیم لڑکوں اور لڑکیوں کی حالت بھی نہایت قابل رحم تھی۔ اُن کے ولی  
اُن کا مال کھا جاتے تھے۔ یا اچھے کی جگہ بُرا بدل دیتے تھے اور اُن کے بالغ

ہونے سے پہلے ہی بے جا طور پر خرچ کر ڈالتے۔ یتیم لڑکیوں کا یہ حال تھا کہ اگر خوبصورت ہوتیں تو بلوغ سے پہلے ہی ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے اور اس جیلہ سے ان کے مال پر بھی قابض اور متصرف ہو جاتے تھے۔ اور اگر بدصورت ہوتیں تو ان کو شادی کرنے سے اس غرض سے روک دیتے تھے کہ وہ کنواری ہی چل بسیں اور ان کا مال ان کو وراثت میں مل جائے۔ حق ہمسائیگی کوئی چیز ہی نہ تھا جس کا پاس و بچاؤ کرتے۔ بجز شراب خواری قمار بازی و بُت پرستی کے اور کچھ کام نہ تھا۔ گھر گھر بت پختے تھے قبیلہ قبیلہ کا خدا جدا تھا قوم کی قوم جاہل تھی۔ اور دنیا کی قوموں سے ایسے بے تعلق اور کونے میں پڑی ہوئی تھی کہ تعلیم و تربیت کی پرچھا میں تک اس پر نہ پڑی تھی۔ اور ایک غیر معلوم زمانہ سے جہالت و ضلالت میں ایسی سرشار اور ڈوبی ہوئی تھی کہ مبداء و معاد کی کچھ خبر ہی نہ تھی یہ لوگ انسان کی ہستی کا مال صرف یہ سمجھے ہوئے تھے کہ جینا مرنا جو کچھ ہے اسی دنیا میں ہے اس کے بعد کچھ نہیں جب وقت پورا ہو جاتا ہے مر جاتے ہیں مارنے جلانے والا کوئی نہیں۔

شمس العلماء مولانا حالی مرحوم نے اہل عرب کے ان حالات کا صحیح نقشہ اپنے مشہور مسدس میں اس طرح کھینچا ہے۔

وہ دنیا میں گھر سے پہلا خدا کا  
ازل میں مشیت سے تھا جس کو تا کا  
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا  
کہ اس گھر سے ایلے کا چشمہ ہدی کا

وہ پیر تک تھا اک بہت پرستوں کا گویا  
 جہاں تین سو ساٹھ بت بچ رہا تھا  
 قبیلہ قبیلاہ کا اک بہت جدا تھا کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا  
 یہ عترتے پہ وہ نالہ پر خدا تھا اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا  
 نہاں ابر ظلمت میں تھا مہرا نور  
 اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر  
 چلن ان کے جتنے تھے سب حشیا نہ ہراک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ  
 فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازہ پانہ  
 وہ تھے قتل و غارت میں عیلاک ایسے  
 درندے ہوں جنگل میں بیباک جیسے  
 نہ ٹلتے تھے ہرگز جوار بیٹھتے تھے سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے  
 جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صد ہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے  
 بلند ایک ہوتا تھا گرواں شرارا  
 تو اس سے بھڑک ٹھٹا تھا ملک سارا  
 وہ بکرا اور تغلب کی باہم لڑائی صدی جس میں آدھی کنوں نے گنوائی  
 قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی  
 نہ جھگڑا کوئی ملک دولت کا تھا وہ

کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ  
 کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا  
 کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا  
 لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا  
 کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا  
 یونہیں وز ہوتی کھٹی تکرار ان میں  
 یونہیں چلتی رہتی کھٹی تلوار ان میں  
 جو ہوتی کھٹی پیاسی گھر میں دختر  
 تو خوفِ شہادت سے بے رحم مادر  
 پھرے دیکھتی جب کھٹی شوہر کے تیور  
 کہیں زندہ گاڑا آتی کھٹی اس کو جاگر  
 وہ گو دایسی نفرت سے کرتی کھٹی خالی  
 جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی  
 جو ان کی دن رات کی دل لگی کھٹی  
 شراب ان کی گھٹی میں گے یا پڑی کھٹی  
 تعیش تھا غفلت کھٹی دیوانگی کھٹی  
 غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی  
 بہت اس طرح ان کو گزری تھی صدیاں  
 کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں  
 اس انتہائی جہالت اور ضلالت کا اقتضا تھا کہ پر وہ غیب سے ایک ہاتھ  
 ربانی قوت و قدرت کے ساتھ پیدا ہو جو ان بد حالیوں اور گمراہیوں پر جنوں  
 نے ایمان و اخلاق کی گردن پر چھری پھیر رکھی تھی جھاڑو پھیر دے۔ چنانچہ  
 اپنے در ماندہ بندوں کو جہل اور گمراہی کے تیرہ وتار بیابان میں آوارہ و



سرگرداں دیکھ کر رحمت حق جوش میں آئی اور خدا کے فرشتے نے اس پاک رسول کو جو رات کے سناٹے میں یکہ و تنہا کوہ حرا کی چوٹی پر اس بیچون و بیچگون ذات کے تصور میں محو تھے نہایت محبت آمیز خطاب کے ساتھ پکارا

”يَا أَيُّهَا الْإِنْدَادُ قُمْ فَاذْهَبْ. وَسَا بَاكَ فَاكْبُرْ. وَتِيَابِكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَا هُجِّرْ. وَلَا تَمَنَّ أَنْ تَسْتَكْبِرْ. وَلسَرِّيَاكَ فَا صَابِرْ. فَاذْهَبْ فِي التَّافُورِ فَاذْهَبْ. بَوْمَيْدٍ عَسِيرٍ عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ لَيْسِيرٍ“

یعنی اڑ جا درہیں لیٹ کر لیٹنے والے اُسٹو۔ اور اپنی گمراہ قوم کو (غذا

خدا سے) ڈراؤ۔ اور اپنے پروردگار کی عظمت اور بزرگی ظاہر کرو

اور پاکی اور پاکدامنی اختیار کرو۔ اور شرک و بت پرستی کی نجاست اور

ناپاکی سے (جس میں تمہاری قوم لتھر رہی تھی) اپنے آپ کو بچاؤ اور

(تبلیغ و رسالت کو) بڑا کار نمایاں سمجھ کر لوگوں پر احسان نہ رکھو۔

اور (تبلیغ و رسالت میں) جو مشکلات پیش آئیں (ان پر) اپنے

پروردگار (کی رضا جوئی) کے لیے صبر کرو۔ اور پھر جبکہ صورت چھوٹنا چکا

تو وہ دن کافروں کے حق میں ایسا مشکل دن ہوگا کہ اس میں مطلق

آسانی نہ ہوگی۔“

اس ندائے غیبی کے سنتے ہی آپ پہاڑ سے اتر کر اپنی قوم کے پاس آئے اور ان کو جہالت اور ضلالت کی گہری نیند سے جگانا شروع کر دیا۔ اور اپنے منصب عالی کے عظیم ترین اور مشکل ترین کام کو ایسے کمال اور کمال طور پر انجام دیا جس کی کوئی نظیر اور مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اور اس نے اپنے پر تاثیر معجزانہ وعظمت سے ایک قابل حیرت قلیل عرصہ میں ملک کے ملک کو خدا شناس اور خدا پرست بنا دیا۔

وہ فخر عرب زبیر محراب و منبر تمام اہل مکہ کو ہمراہ لے کر گیا ایک دن حسب فرمانِ دادہ سوئے دشت اور چڑھ کے کوہ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اے آلِ غالب

سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا  
کہا اگر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر

پڑی ہو کہ لوے تمہیں گھات پا کر

کہا تیری ہر بات کا یاں یقین ہو کہ بچپن سے صادق ہو تو اور میں ہو

کہا اگر مری بات یہ دل نشیں ہو تو سن لو خلاف اس میں ہلا نہیں ہو

کہ سب قافلہ یہاں سے ہو جانے والا

ڈرو اس سے جو وقت ہی آنے والا

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی  
نئی اک لگن دل میں سب کے لگادی اک آواز میں سوئی سستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق سے  
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

غرض صرف ۲۳ برس کے محدود عرصہ میں وہی عرب جو باطل پرستی پر جاری  
بداخلاقی اور طرح طرح کی بُرائیوں کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں صدیوں سے آوارہ  
وسرگرداں تھا خالص ایمان باللہ اور مکارمِ اخلاق کی چمکا چوند روشنی سے  
منور ہو گیا۔ شرک و مخلوق پرستی کی نجاست سے دل پاک و صاف ہو گئے۔  
زہد و تقویٰ پاکی اور پاکدامنی ہر شخص کا شعار ہو گئی۔ خدا کے گھر سے بت نکالے  
گئے اور چاروں طرف خالص توحید کا ڈنکا بجنے لگا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید کی تعلیم نے وہ اثر دکھلایا کہ عرب کے بت پرست  
جاہل اور بد اخلاق لوگ دنیا میں سب سے زیادہ عالم سب سے زیادہ خدا پرست  
سب سے زیادہ متمدن سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور سب سے زیادہ طاقتور  
بن گئے اور اس تعلیم نے بہت جلد ان میں ایسا کامل ایمان ایسے راسخ  
عقیدے ایسے پاکیزہ اخلاق اور ایسی غیر معمولی اولوالعزمی پیدا کر دی کہ  
ایک طرف تو وہ خدا کے سچے پرستار بن گئے اور دوسری طرف

چند سال کے عرصہ میں دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں نے متفقہ طور سے ان کے سامنے سرطاعت خم کر دیا۔

جنگ قادسیہ کے موقعہ پر جو ۱۰۷ھ میں ہوئی تھی ایک ایرانی جنرل نے کہا تھا کہ ہم لوگ ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے یہ رات کو فرشتے ہوتے ہیں اور دن کو شیر۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ کلام پاک جس کی معجزانہ اور حیرت انگیز مدد سے نے مرہ عرب کو اس طرح زندہ جاوید کر دیا اور وحشیوں کو ہذب جاہلوں کو عالم اور غافلوں کو عارف باللہ بنا دیا۔ اگر وحی و الہام نہ تھا تو اور کیا تھا؟ اور کیا یہ ممکن تھا کہ بغیر تعلیم الہی اور ہدایت ربانی کے کوئی انسان خصوصاً ایک ایسا شخص جو امی محض ہو ایسا معجزانہ کلام کر سکے۔

یورینڈ مسٹر باسور تہ ایم۔ اے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اپنی مشہور کتاب محمدن اینڈ محمد نزم میں مسلمانوں کی ہجرت حبش کے تذکرہ کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ اس ہجرت کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں حضرت محمدؐ کی ابتدائی تعلیم کا ایک اعلیٰ درجہ کا خلاصہ ہاتھ آ گیا جو اب تک ہمارے پاس موجود ہے۔ یعنی جب نجاشی شاہ حبش نے مسلمانوں کو اپنے دربار میں بلا کر ان کے نئے مذہب کی بابت استفسار کیا تو حضرت جعفرؓ نے مسلمانوں کا نامندہ بن کر نجاشی کے دربار میں ایک تقریر کی اور اس میں مختصر طور پر اسلامی تعلیم کی نوعیت بادشاہ کو

سمجھائی ہو۔ مسٹر پاسور تھو اسمتھ نے اپنی کتاب میں حضرت جعفر کی تقریر کا ترجمہ انگریزی میں دسج کیا ہے۔ اور تالیخ ابن ہشام میں حضرت جعفر کے اصل الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کو پیش نظر رکھ کر اس تقریر کا اردو ترجمہ تحریر کیا جاتا ہے۔

ار بادشاہ ہم ایک جاہل اور گمراہ قوم تھے۔ بت پوجتے تھے۔ مردار گشت کھایا کرتے تھے۔ بدگوئیاں اور بدکاریاں کیا کرتے تھے ہم بنی نوع انسان کے جذبات اور حسیات کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے۔ جہاں نوازی کے فرایض سے غافل تھے۔ ہمسایوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے۔ زبردست کمزور کا مال کھا جاتا تھا۔ ایک مدت سے ہماری یہی حالت چلی آتی تھی یہاں تک کہ خدا نے ہمارے ہی میں سے ایک پیغمبر ہمارے پاس بھیجا۔ جس کی شرافت نسب۔ رہتباری۔ ایمان داری اور پاک دامنی سے ہم خوب واقف تھے اس نے ہم کو خدا کی وحدانیت کی طرف بلا یا تا کہ ہم صرف اسی ایک خدا کو خدا جانیں اور اسی کی عبادت کریں۔ اور ان بتوں اور پتھروں کی پرستش چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے اور حکم دیا کہ ہم صرف خدا ہی کی عبادت کریں اور کسی پتھر کو ذات۔ صفات۔ اور استحقاق عبادت میں اس کے ساتھ شریک کریں

اور ہم کو پانچوں وقت نماز پڑھنے اور سال بھر کے بعد بقیہ مال کا  
چالیسواں حصہ صدقہ دینے۔ اور ماہ رمضان میں سوائے بیماری اور  
سفر کے روزہ رکھنے کا حکم دیا (پھر ایک ایک کر کے تمام احکام اسلام  
اُس کے سامنے بیان کیے اور کہا کہ) اُس پیغمبر نے ہم کو سچ بولنے  
اور امانت کو اُس کے مالک کے پاس پہنچا دینے۔ عاجزوں پر  
رحم کرنے۔ اور قرابت داروں سے رعایت و مروت کرنے اور  
ہمسایوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنے اور بُرے اور حرام کاموں اور  
خون خرابوں سے بچنے کا علم دیا۔ اور بدکاریوں اور جھوٹی گواہی دینے  
اور بن ماں باپ کے بچوں کے مال کھالینے اور پاکدامن عورتوں  
پر تہمت لگانے سے منع کیا پس ہم نے اُس کو سچا جانا اور جو حکام  
خدا کی طرف سے اُس نے پہنچائے اُن کی پیروی اختیار کی۔ ہذا  
ہم صرف اگ ہی خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ اور کسی چیز کو کسی بات میں  
بھی اُس کے ساتھ شریک نہیں کرتے۔ اور جو چیز خدا نے ہم پر حرام کر دی  
ہو اُس کو حرام اور جو حلال کر دی ہو اُس کو حلال جانتے ہیں پس  
اس بات پر ہماری قوم ہماری دشمن ہو گئی۔ اور طح طح سے ہم کو دکھ  
دیا۔ اور ہم کو ہمارے دین سے پھراناجا ہا کہ خدا کو چھوڑ کر پھر پھراؤ  
لکڑی کے بت بوجھے لگیں! اور جن بُری باتوں اور چیزوں کو ہم

چھوڑ چکے ہیں اور نا جاڑتے سمجھتے ہیں اُن کو جاڑتے سمجھیں۔“

اسلام سے پیشتر مکہ کے جو تیرہ وٹا ر حالت تھی اور پھر اسلام نے جو روحانی اور اخلاقی روشنی اُس میں پھیلانی یہ تقریباً اُس کا مختصر مگر صحیح فوٹو ہے۔ قرآن مجید قوانین کا ایک مجموعہ ہے جس میں بنی آدم کی روحانی۔ اخلاقی اور معاشرتی ہدایت اور رہنمائی کے علاوہ تمدن۔ سیاست اور جہان بینی کے اصول و قواعد بھی منضبط کئے گئے ہیں۔ دُنیا کے بڑے بڑے نامور مفکرین جو بڑی بڑی سلطنتوں اور حکومتوں کے رکن اعظم ہوتے ہیں۔ اہل ملک کے سو دو پوپوں کے لئے مہینوں بلکہ برسوں کے غور و فکر اور بحث و مباحثہ کے بعد جو قانون مرتب کرتے ہیں اُن کے نافذ ہوتے ہی اُن کے نقایص نمایاں ہونے لگتے ہیں اور ترمیمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہاں تک کہ چند سال کے بعد اُس قانون کی ہیئت بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ مگر کلام الہی میں جو قانون اور قاعدے مقرر کر دیئے گئے ہیں ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی اُن میں کسی ترمیم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بلکہ حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ طلاق اور تعدد و ازدواج وغیرہ جیسے اسلام کے معاشرتی قوانین جو کچھ عرصہ پیشتر مغرب کے شاہیستہ اور مہذب ممالک میں ہدف طعن و تشنیع بنے ہوئے تھے آج اُنھیں ممالک میں وہی اصول قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے

جا رہے ہیں۔ اور انھیں اصولوں کے اتباع کی طرف میلان خاطر پایا جاتا ہے۔  
 غرض قرآن مجید نے جس طرح انسان کی باطنی یعنی روحانی اور اخلاقی حالت  
 کی اصلاح اور اس کے ترقی دینے میں حصہ لیا، وہ اسی طرح اس کے ظاہری اور  
 سوشل حالت کی ترقی اور اصلاح کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس کے مواعظ  
 و احکام سے جیسے کہ فرداً فرداً لوگوں کی باطنی اور ظاہری حالت کی اصلاح اور  
 ترقی ہوئی ویسی ہی ان کی مجموعی اور تمدنی حالت کو عظمت اور شوکت عزت  
 اور عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ اس کا اصلی اور مقصود بالذات کام انسان کی  
 روحانی اور اخلاقی حالت کی اصلاح کرنا اور اس کو ترقی دے کر اس اعلیٰ  
 درجہ پر پہنچا دینا تھا جس کے لیے وہ مخلوق ہوا ہے۔ یعنی تقرب ذات الہی۔ اور  
 حیات آخرت۔ اور علم غیر محسوس کی غیر محدود سعادت و مسرت کا حاصل کرنا  
 مگر یہ اس کے کمال خوبی اور عمدگی کی دلیل ہے کہ اس نے روحانی اور اخلاقی  
 نیکیوں کی تعلیم کے ساتھ تمدن اور حسن معاشرت کی نیکیوں کی بھی بدرجہ اتم  
 تعلیم کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی روحانی ترقی اور عروج کے ساتھ ان کی  
 ظاہری اور تمدنی حالت کی بھی اصلاح اور ترقی ہوتی گئی۔

اس رسالہ میں قرآن مجید کی تعلیم پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہو سکتی  
 اس کی ہدایت کے نتائج کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پیش نظر



رکھ کر چند غیر مذہب کے علما اور فضلا اور محققین کی رائیں ذیل میں درج کرنا مفید تر معلوم ہوتا ہے۔ یہ رائیں ان معروف تاریخی حالات اور واقعات پر مبنی ہیں جن کا ان میں ذکر ہو۔ اور جن سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَا أَنْتَ بِهِ الْآخِذَاءُ۔

(۱) آئر ہیل سر ولیم میور جو ایک بلند پایہ عیسائی محقق ہیں اور جب تک کہ علانیہ اور روشن وجہ نہ ہو اسلام کے حق میں گواہی نہیں دے سکتے۔ اپنی کتاب "لائف آف محمد" میں لکھتے ہیں (صفحہ ۲۹۹-۲۶۱-۲۶۱ مطبوعہ ۱۸۶۱ء)۔

اگرچہ محمدؐ کے ادا کردہ احکام اس وقت تک تھوڑے سے اور سادہ طور کے تھے مگر انھوں نے ایک تعجب انگیز اور عظیم الشان کام کیا۔ جبکہ دین سچی نے دنیا کو خواب غفلت سے بیدار کیا تھا اور مشرک بتی سے جہاد عظیم کیا تھا اس وقت سے جیات روحانی کبھی ایسی برانگیختہ نہ ہوئی تھی اور نہ ایسا غلو کسی مذہب میں ہوا تھا جیسا کہ دین اسلام میں ہوا۔ اس دین کے نوش اعتقاد پیروؤں نے کیسے کیسے نقصانات صرف اپنے ایمان کی خاطر اٹھائے۔ ہجرت سے تیرہ برس پہلے تو مکہ ذلیل حالت میں بے جان پڑا تھا۔ مگر ان تیرہ برسوں نے کیا ہی اثر عظیم پیدا کیا۔ کہ سیکڑوں آدمیوں کی جماعت نے بت پرستی چھوڑ کر خدائے واحد کی پرستش اختیار کی..... ہجرت کے بعد مدینہ

میں بھی اسی جادو بھری تاثیر نے دو یا تین برس کے عرصہ میں ان لوگوں کے واسطے ایک ایسی برادری تیار کر دی جو بنی اور مسلمانوں کی حمایت میں جان دینے کو مستعد ہو گئی۔

مسرو لیم میورا اپنی اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

”ہم بے تامل اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اُس نے (یعنی مذہب اسلام نے) ہمیشہ کے واسطے اکثر توہمات باطلہ کو جن کی تاریکی مدتوں سے عرب کے ملک پر چھا رہی تھی کا لُغوم کر دیا۔ اسلام کی صدائے جنگ کے رد و بُت پرستی موقوف ہو گئی۔ اور خدا کی صدا نیت اور غیر محدود کمالات اور ایک ہر جگہ احاطہ کرنے والی قدرت کا مسئلہ حضرت محمد کے معتقدوں کے دلوں میں اور جانوں میں ایسا ہی زندہ اصول ہو گیا جو جیسا کہ خاص حضرت محمد کے دل میں تھا۔ مذہب اسلام میں سب سے پہلی بات جو خاص اسلام کے معنی ہیں یہ ہے کہ خدا کی مرضی پر توکل مطلق کرنا چاہیے۔ بلحاظ معاشرت کے بھی اسلام میں

لے صدائے جنگ نے بت پرستی کو معدوم نہیں کیا بلکہ قرآن مجید کے نہایت فصیح اور پرتاثر فقرات سے لوگوں کے دلوں پر جو اثر ہوتا تھا اُس نے نہ صرف عربی بت پرستی کو نیست و نابود کر دیا بلکہ تمام مذہبوں میں جو اُس وقت دنیا میں راجح تھے اور جہاں تک اسلام کے وا عظموں کی آواز پہنچتی تھی یہ خیال پیدا کر دیا کہ بت پرستی نہایت کمینہ نصلت اور ایک سخت گناہ ہے۔ ۱۲-۵

کچھ کم خوبیاں نہیں ہیں چنانچہ مذہب اسلام میں یہ ہدایت ہے کہ  
 سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ محبت رکھیں  
 یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا چاہیے۔ غلاموں کے ساتھ انتہائی  
 شفقت برتنی چاہیے۔ فتنہ کی چیزوں کی ممانعت ہے۔ مذہب اسلام  
 اس بات پر فخر کر سکتا ہے کہ اس میں پرہیزگاری کا ایک ایسا درجہ  
 موجود ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔“

(نوٹ مولف۔ سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے اس عبارت  
 کے سلسلہ میں اپنی کتاب کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ ”اس میں تناقض  
 اور کرنا چاہیے تھا کہ مذہب اسلام نے قمار بازی کو منع کرنے  
 اور ناشائستہ کلمات منہ سے نکالنے کی ممانعت سے اور والدین  
 کے ساتھ محبت اور تعظیم سے پیش آنے کی تاکید سے اور ایک  
 مناسب انداز سے خیرات دینے کی ترغیب سے۔ لوگوں کو ان  
 کی حاجت کے وقت قرض حسنہ دینے اور وعدہ وفا کرنے کی  
 تاکید سے جانوروں کے ساتھ رحم اور مہربانی کا برتاؤ کرنے کے  
 حکم سے انسانوں کے اخلاق اور ان کے حسن معاشرت میں بہت  
 کچھ ترقی دی ہے۔“)

۷۔ زوال سلطنت رومۃ الکبریٰ کا مشہور فاضل مؤرخ ایڈورڈ

گین لکھتا ہے کہ یہ (جلد پنجم پچاسواں باب صفحہ ۴۶۹-۴۷۰)

مخبر کا مذہب شکوک اور شبہات سے پاک و صاف ہے۔ قرآن خدا

کی وحدانیت پر ایک عمدہ شہادت ہے کہ کے پیغمبر نے بتوں کی اینٹوں

کی۔ ثوابت اور سیاروں کی پستی کو اس معقول دلیل سے روکنا کہ

جو شو طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے۔ اور جو حادث ہے وہ فانی

ہوتی ہے۔ اور جو شو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے اس نے

اپنی معقول سرگرمی سے کائنات کے بانی کو ایک ایسا وجود

تسلیم کیا جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔ نہ وہ کسی شکل میں محدود

کسی مکان میں۔ نہ اس کا کوئی ثانی وجود ہے جس سے اس کو تشبیہ

دے سکیں۔ وہ ہمارے نہایت خفیہ رازوں پر کبھی آگاہ رہتا

ہے۔ بغیر کسی اسباب کے موجود ہے۔ اخلاق اور عقل کا کمال جو اس کو

حاصل ہے وہ اس کو اپنی ذات سے حاصل ہے۔ ان بڑی بڑی خالق

کو پیغمبر نے مشہور کیا۔ اور اس کے پیروں نے اس کو نہایت

مستحکم طور سے قبول کیا۔ اور قرآن کے مفسروں نے معقولات

کے ذریعہ سے ان کی تشریح و تصریح کی ہے۔ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ

کے وجود اور اس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے

مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہے اس لیے کہ جب ہم نے اس نامعلوم چیز (خدا) کو زمان و مکان اور حرکت اور مادہ اور حس و فکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیے کیا چیز باقی رہ گئی وہ اصل (یعنی توحید ذات و صفات باری تعالیٰ) جس کی بنا عقل اور وحی پر ہی محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچے۔ چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لیکر مراکوت تک موحد کے لقب سے ممتاز ہیں۔ اور تصویروں کے ممنوع کر دینے سے بت پرستی کا خطرہ مٹا دیا گیا۔

یہی فاضل مورخ دوسری جگہ جہاں یہ بحث کرتا ہے کہ حضرت محمدؐ اپنے ملک کے عت میں کیسے تھے لکھتا ہے کہ

حضرت محمدؐ کی سیرت میں سب سے آخریات جو غور کرنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ ان کا عروج لوگوں کی بھلائی اور بہبود کے لحاظ سے مفید ہوا یا مضر۔ جو لوگ آنحضرتؐ کے سخت دشمن ہیں وہ بھی اور نہایت متعصب یہودی اور عیسائی بھی ان کو پیغمبر برحق نہ ماننے کے باوجود اس بات کو ضرور تسلیم کریں گے کہ آنحضرتؐ نے دعویٰ رسالت ایک نہایت مفید مسئلہ کی تحقیق کے لیے اختیار کیا۔ گو وہ یہ کہیں کہ صرف ایک

ہمارے ہی مذہب کا مسئلہ اُس سے اچھا ہوگا گو یا وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سوائے ہمارے مذہب کے اور تمام دنیا کے مذہبوں سے مذہب اسلام اچھا ہی! آنحضرت یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب سماویہ قدیمہ کی سچائی اور پائیزگی اور ان کے بانیوں یعنی اگلے پیغمبروں کی نیکیوں اور محجروں اور ایمانداروں کو مذہب اسلام کی بنیاد خیال کرتے تھے۔ عرب کے بت خدا کے تخت کے روپر و تڑپے گئے۔ اور انسانوں کے خون کے کفارہ کو نماز روزہ اور خیرات سے بدل دیا۔ جو ایک پسندیدہ اور سیدھے سادے طریقہ کی عبادت ہو یعنی انسان کی جو قربانی بتوں پر ہوتی تھی اُس کو معدوم کیا اور اُس کے عیوض نماز روزہ اور خیرات کو کفارہ قرار دیا۔ ان کے عقے کی جزا و سزا ایسی تمثیلوں میں بیان کی جو ایک جاہل اور مہما پرست قوم کی طبیعت کے لیے نہایت موزوں تھیں۔

آنحضرت نے مسلمانوں میں نیکی اور محبت کی ایک روح ڈالی آپس میں بھلائی کرنے کی ہدایت کی اور اپنے احکام اور نصیحتوں سے انتقام کی خواہش اور بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم ہونے کو روک دیا۔ تو میں جو کہ باہم مخالف تھیں اعتقاد اور فرماں برداری میں متفق ہو گئیں جو بہادری خانگی جھگڑوں میں بے ہودہ طور سے

صرف ہوتی تھی نہایت مستعدی سے ایک غیر ملک کے دشمن کے  
مقابلہ پر مائل ہو گئی؛

یہی مورخ اسلام کے متعلق دوسری جگہ لکھتا ہے:-

”اسلام نے کسی مذہب کے مسائل میں دست اندازی نہیں کی کسی کو  
ایذا نہیں پہنچائی۔ کوئی مذہبی عدالت خلاف مذہب والوں کو  
سزا دینے کے لیے قائم نہیں کی۔ اور اسلام نے کبھی لوگوں کے  
مذہب کو بہ جبر تبدیل کرنے کا قصد نہیں کیا۔ ہاں اس نے اپنے مائل  
کا جاری ہونا چاہا مگر ان کو جبراً جاری نہیں کیا۔ اسلام قبول کرنے  
سے لوگوں کو فحتمندوں کے برابر حقوق حاصل ہو جاتے تھے اور مفتوحہ  
سلطنتیں ان شرائط و قیود سے بھی آزاد ہو جاتی تھیں جی ہر ایک  
فحتمند ابتدائے دنیا سے حضرت محمدؐ کے زمانہ تک ہمیشہ عاید کیا کرتا تھا“

مشرایڈ و رڈ گین ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

”اسلام کی تاریخ میں ایک ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو دوسرے  
مذہب کو غیر آزاد رکھنے کے بالکل برخلاف ہے۔ اسلام کی تاریخ کے  
ہر ایک صفحہ میں اور ہر ایک ملک میں جہاں اس کو وسعت ہوئی

دوسرے مذہب سے مزاحمت نہ کرنا پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ  
 فلسطین میں ایک عیسائی شاعر "لامارٹین" نے ان واقعات کے  
 جن کا ہم ذکر کر رہے ہیں بارہ سو برس کے بعد علانیہ یہ کہا تھا کہ صرف  
 مسلمان ہی تمام روئے زمین پر ایک ایسی قوم ہیں جو دوسرے مذہب  
 کو آزادی سے رکھتی ہیں۔"

۴۔ مسٹر جان ڈیون پورٹ جن کا ذکر آنحضرت صلعم کے حالات کے  
 سلسلے میں ہو چکا ہے۔ اپنی کتاب "اپا لوفار محمد اینڈ وی قرآن" میں لکھتے ہیں کہ  
 "ایسا خیال کرنا جیسا کہ بعضوں نے کیا ہے بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن  
 میں جس عقیدہ کی تلقین کی گئی ہے اس کی اشاعت بزرگ شمشیر ہونی چھٹی۔  
 کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں تعصب سے مبرا ہیں وہ سب اس بات  
 کو تسلیم کریں گی کہ حضرت محمد کا دین (جس کے ذریعہ سے انسانوں کے  
 خون یعنی قربانی کے بدلے نماز روزہ اور خیرات جاری ہوئی۔ اور  
 جس نے عداوت اور دائمی جھگڑوں کی جگہ قیاضی اور حسن معاشرت  
 کی ایک روح لوگوں میں پھونک دی اور جس کا اسی وجہ سے بہت  
 بڑا اثر شائستگی پر ہوا ہوگا) مشرقی دنیا کے لیے ایک حقیقی برکت تھا  
 اور اس وجہ سے فاضل مس کو ان خونریز تداپیر کی حاجت نہ پڑی



ہوگی جن کا استعمال بلا استثنا اور بلا امتیاز حضرت موسیٰ نے بت پرستی  
 کے نسبت و نابود کرنے کو کیا تھا۔ پس ایسے اعلیٰ وسیلہ کے ساتھ  
 جس کو قدرت نے بنی نوع انسان کے خیالات اور مسائل پر مدت  
 دراز تک اثر ڈالنے کو پیدا کیا ہے گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ مذمت کرنا  
 کیسی لغو اور بے ہودہ بات ہے۔ جب ان معاملات پر خواہ اس  
 مذہب کے بانی کے لحاظ سے خواہ اس مذہب کے عجیب و غریب  
 عروج اور ترقی کے لحاظ سے نظر کی جاوے تو بجز اس کے اور کچھ  
 چارہ نہیں کہ اس پر نہایت دل سے توجہ کی جائے۔ اس امر میں کچھ  
 بھی مشبہ نہیں ہو سکتا کہ جن لوگوں نے مذہب اسلام اور مذہب شیبوی  
 کی خوبیوں کو بمقابلہ ایک دوسرے کے تحقیق کیا ہے اور ان پر غور  
 کیا ہے ان میں سے بہت ہی کم ایسے بھی ہیں جو اس تحقیقات  
 میں اکثر اوقات تردد اور اس بات کے تسلیم کرنے پر مجبور  
 ہوئے ہیں کہ مذہب اسلام کے احکام بہت ہی عمدہ اور مفید  
 مقاصد ہیں بلکہ اس بات کا اعتقاد کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں  
 کہ آخر کار انسان کو مذہب اسلام سے فائدہ کثیر ہو گا۔  
 مسٹر جان ڈیون پورٹ نے اپنی اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے  
 ”ہر ایک طرح کی شہادت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جن شخصوں نے

فلسفہ اور علوم و فنون کو سب سے پہلے زندہ کیا جو قدیمی اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان بطور ایک سلسلے کے بیان کیے گئے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایشیا کے مسلمان اور اندلس کے مورثے جو خلفائے عباسیہ اور بنی امیہ کے عہد میں وہاں رہتے تھے۔ علم جو ابتداءً ایشیا سے یورپ میں آیا تھا اس کا وہاں دوبارہ رواج مذہب اسلام کی دانشمندی سے ہوا۔ یہ بات معروف و مشہور ہے کہ اہل عرب میں چھ سو برس کے قریب سے علوم و فنون جاری تھے۔ اور یورپ میں جہالت و وحشیانہ پن پھیلا ہوا تھا اور علم ادب تقریباً نیست و نابود ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ تمام علوم طبیعیات۔ ہیئت۔ فلسفہ۔ ریاضی جو دسویں صدی میں یورپ میں جاری تھے۔ ابتداً عرب کے علماء سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصاً اندلس کے مسلمان فلسفہ کے موجد خیال کیے جاتے ہیں۔“

مسٹر جان ڈیون پورٹ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

یورپ مذہب اسلام کا اور بھی زیادہ ممنون ہے کیونکہ اگر ان جھگڑوں سے جو سلطان صلاح الدین کے وقت میں بیت المقدس کی لڑائیوں میں ہوئے جن کو فریقین جہاد کہتے تھے قطع نظر کی جاوے تو بتائیں

مسلمانوں کے سبب سے فیوڈل انتظام کی سختیاں اور امیروں کی  
خونخیزی یورپ سے موقوف ہو گئی جن کے اثرات پر ہمارے ملک  
یورپ کی آزادیوں کی نہایت بڑی اور عالی شان عمارت کی بنیاد  
قائم ہوئی۔ اہل یورپ کو یہ بات بھی یاد دلانا چاہیے کہ وہ حضرت محمدؐ  
کے پیروؤں کے جو قدیم اور زمانہ حال کے علم ادب کے درمیان  
بطور سلسلہ کے ذریعہ ہیں) اس لحاظ سے کبھی ممنون ہیں کہ مغربی  
تاریکی کی مدت دراز میں یونانی حکما کی بہت سی کتابیں فنون  
اور علوم ریاضی اور طب وغیرہ کے نہایت بڑے بڑے شعبوں  
کی انہیں کی کوششوں سے اشاعت پذیر ہوئیں۔  
یہی فاضل محقق آگے چل کر لکھتے ہیں۔

کہ ”جملہ بہت سی اعلیٰ درجہ کی خوبیوں کے جو قرآن کے لیے واجب  
طور پر باعث فخر و ناز ہو سکتی ہیں دو خوبیاں نہایت بین ہیں یعنی  
اول تو اس کا وہ مودبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا ہوا

۱۵ فیوڈل انتظام سے وہ انتظام متصور ہے جس کی راسخا اور وزیرا کو اس شرط پر زمینیں درجاگیر دی جاپا  
کرتی تھیں کہ وہ جنگ کے وقت حکومت کے لیے لڑنے والے سپاہی مہیا کیا کریں۔ اس انتظام میں  
امرا کی طرف سے ظلم بہت ہوتے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک شخصی آزادی کا اصول جس کی اسلام  
نے تعلیم دی تھی یورپ میں رائج نہ تھا ۱۲ مولف

طرز بیان جو ہر اس مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ ہو اختیار کیا گیا ہے اور جس میں خداوند عالم کی ذات سے نجات اور اخلاقی نقایص کو منسوب نہیں کیا گیا جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ دوسرے اس کا ان تمام خیالات والفاظ اور قصوں سے مبرا ہونا جو فحش اور خلاف اخلاق اور غیر مہذب ہوں۔ حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیب توریت وغیرہ کتب مقدسہ یہودیہ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت قرآن ان سخت عیوب سے ایسا مبرا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں۔ اول سے آخر تک اسے پڑھ جائیے تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاو گے جو پڑھنے والے کے چہرہ پر شرم و حیا کے آثار پیدا کرے۔ قرآن میں ذات باری کی تعریف نہایت مشرح اور صاف ہے۔ اور جو مذہب اس نے ان خوبیوں کے ساتھ قائم کیا ہے وہ وحدانیت الہی کا نہایت پختہ اور شدید یقین ہے۔ اور بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر صرف ایسا سبب الاسباب مان لیا جاوے جو اس عالم کو اپنے مقررہ قوانین پر چلا کر خود اسی شان و عظمت کے ساتھ الگ ہے کہ اس تک کوئی شے نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کی رو سے وہ ہر وقت حاضر و ناظر ہے

اور اس کی قدرت کاملہ ہمیشہ اس عالم میں عامل اور متصرف ہے،  
 علاوہ ازیں اسلام ایسا مذہب ہے جس کے اصول میں کوئی امر  
 متنازعہ فیہ نہیں اور چونکہ اس میں کوئی ایسا معتمہ نہیں جو سمجھ میں نہ  
 آئے اور زبردستی قبول کرنا پڑے اس لئے وہ لوگوں کے خیالات  
 کو ایک سیدھی سادی اور ایسی پرستش پر قائم رکھتا ہے جو تغیر پذیر  
 نہیں ہے۔ حالانکہ تیز و تند اور اندھا دند جو شناہی نے پیران  
 اسلام کو اکثر اوقات آپسے سے باہر کر دیا ہے۔“

”سب سے آخر یہ بات ہے کہ اسلام ایسا مذہب ہے کہ جس سے دلیوں  
 شہید ہوں۔ اور تبرکات اور تصویروں کی پرستش اور ناقابل فہم تہیں  
 اور حکیمانہ باریکیاں اور راہبوں کی بجز بیاور تغذیب نفس بالکل خارج  
 کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اسلام میں ایسے ثبوت موجود ہیں جن پر  
 خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بانی نے ماہیت شیا  
 اور اس زمانہ کی قوموں کی حالت اور نیز اس امر پر کہ مسائل  
 مذہبی عقل سے کیونکر مطابق ہو سکتے ہیں۔ ایک طویل اور عمیق  
 غور کے بعد اپنے مذہب کی بنا ڈالی ہے۔ اور اس وجہ سے یہ کچھ  
 محل تعجب نہیں ہے کہ اسلامی طور کی پرستش اہل کعبہ کی بت پرستی  
 اور صابن کی پرستش اجرام فلکی اور زرتشتیوں کی آتش پرستی

پر غالب آگئی!

۴۔ مسٹر گاڈ فرے مگنس اپنی کتاب ”اپالوجی فار محمدؐ“ کے فقرہ ۱۰۵ میں لکھتے ہیں کہ

حضرت مسیح کی انجیل کی طرح قرآن مجید غریب آدمیوں کا دوست اور غمخوار ہوا۔ بڑے اور دو لقمند آدمیوں کی بے انصافی کی ہر جگہ مدد کی گئی ہے۔ وہ آدمیوں کی باعتبار شخصیت اور مدارج کے توفیر نہیں کرتا (نوٹ) بلکہ اسلام کی تعلیم کے مطابق سب سے زیادہ موثر وہ انسان ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور خالصے ڈرنے والا ہو۔ مولف قرآن میں ایک بھی ایسا کوئی حکم نہیں بتلایا جاسکتا جس میں پوئیل خوشامد اور رواداری کی طرف ذرا سا بھی میل ہو!

ولسٹن سٹریٹریو نے نہایت منصفانہ رائے دی ہے کہ ”اگر کسی خود مختار مشرقی فرماں روا کو کوئی چیز کبھی روک سکتی ہے تو وہ غالباً ایک جرات رکھنے والے مظلوم کی زبانی قرآن مجید کی ایک بے تکلف آیت ہو سکتی ہے۔“

.... آگے چل کر فقرہ ۱۰۵ اور ۱۰۶ میں مسٹر گاڈ فرے مگنس فرماتے ہیں کہ

یہ خیال کرنا ایک بہت بڑی غلطی ہے کہ دین محمدی صرف بزور  
 شمشیر پھیلا ہے۔ جن لوگوں کا ایسا خیال ہے وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں  
 کیونکہ دین اسلام ان قوموں نے بھی اختیار کیا ہے جن کو مسلمانوں  
 کے ہتھیاروں کی قوت سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔۔۔ مسلمانوں پر  
 ترکوں کا پہلا حملہ آٹھویں صدی کے آخر میں ہوا تھا۔ یہ لوگ ملک  
 شمال سے جو ماہین بحر کا سپین اور بحر اسود کے واقع ہوئے۔ اس  
 وقت تک ترکوں نے دین محمدی اختیار نہیں کیا تھا مگر تھوڑے  
 ہی عرصہ کے بعد انہوں نے ان مغلوب مسلمانوں کا مذہب قبول  
 کر لیا۔ ان فاتحین کے اس تبدیل مذہب سے وہ الزم جو بار بار  
 دوہرایا جاتا ہے کہ دین اسلام کی کامیابی بزور شمشیر ہوئی ہے، نہایت  
 عجیب و غریب طور پر باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے صاف  
 ثابت ہوتا ہے کہ دین اسلام میں صرف وہی لوگ داخل نہیں  
 ہوئے جو اس نے زیر کئے بلکہ وہ لوگ بھی داخل ہوئے جنہوں  
 نے مسلمانوں کو مغلوب اور مطیع کیا۔

۵۔ ریورینڈ جی۔ ایم۔ راد ویل صاحب جنہوں نے قرآن مجید کا انگریزی  
 میں ترجمہ کیا ہے۔ اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں قرآن مجید کی تعلیمات کی تاثیر کی





اور سچی محبت اور سب سے بڑھ کر توکل بخدا اور انقیاد امر الہی کو  
حقیقی ایمانداری کی اصل بنیاد اور مومن صادق کا اصلی نشان قرار  
دیا ہے۔

۷۔ ایک عیسائی مضمون نگار کا بیان سر سید احمد خاں صاحب مرحوم نے اپنی  
کتاب خطبات احمدیہ کے چوتھے خطبہ میں یہ مضمون نقل کیا ہے۔  
ایک جو اب مضمون لکھنے والے نے جس نے یہ مضمون اختیار کیا تھا  
کہ "اسلام ایک ملکی انتظام ہے جو شرق و غرب میں جاری ہے" اسلام کی  
نسبت یہ لکھا ہے کہ "اسلام نے پچکشتی کی رسم کا انسداد کر دیا جو اُس  
زمانہ میں قرب و جوار کے ملکوں میں جاری تھی۔ گو عیسائی مذہب نے  
بھی اُس کو روکا تھا مگر اسلام کی برابر اُس کو کامیابی نہیں ہوئی  
اسلام نے غلامی کو موقوف کر دیا جو اُس ملک کی پرانی جاہلیت کی  
زعم تھی اسلام نے ملکی حقوق کو برابر کر دیا اور صرف اُنھیں لوگوں کے  
حق میں انصاف نہیں کیا جو اس مذہب کے معتقد تھے بلکہ اُن شخصوں  
کے ساتھ بھی یکساں انصاف کیا جن کو اُس کے ہتھیاروں نے  
فتح کیا تھا۔ اسلام نے اُس محصول کو جو سلطنت کو دیا جاتا تھا گھٹا کر  
صرف دسواں حصہ کر دیا۔ اسلام نے تجارت کو تمام محصولات اور

مذاہمتوں سے آزاد کر دیا۔ اسلام نے مذہب کے معتقدوں کو اس سے بری کر دیا کہ اپنے مذہبی سرگروہ کو یا مذہبی کام کیلئے جبریہ روپیہ دیں۔ اور تمام لوگوں کو اس سے بری کر دیا کہ غالب مذہب کو ہر قسم کا مذہبی چندہ دیں۔ اسلام نے فرقہ فتنہ کے تمام حقوق مفتوحہ لوگوں میں سے ان شخصوں کو بھی دیئے جو اپنے مذہب کے پابند رہے۔ ان کو ہر قسم کی پناہ دی۔ اسلام نے مال کی حفاظت کی سود لینے کو اور خون کا بدلہ بغیر حکم عدالت کے لینے کو موقوف کیا۔ صفائی اور پرہیزگاری کا تحفظ کیا حرام کاری موقوف کی غریبوں کو خیرات دینے اور ہر شخص کی تعظیم کرنے کی ہدایت کی۔“

۸۔ رپورینڈ کینن آنزک ٹیلر کا بیان  
 مسٹر آنزک ٹیلر صاحب نے جو انگلستان کے مشہور و معروف عالم اور محقق تھے اور جو ۱۸۸۵ء میں کینن کے رتبہ پر فائز ہوئے تھے جو ہشپ کی طرح ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ پر قبضہ و ولولہ سمیٹنے کی چرچ کانگریس کے روبرو افریقہ میں اسلام کی ترقی کی بابت ایک مضمون پڑھا تھا جو اجبار لندن ٹاکر اور سینیٹ جمیس گزٹ لندن مورخہ ۸ اکتوبر ۱۸۸۵ء میں شایع ہوا تھا اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہم کو یہ اقرار کرنا چاہیے کہ اسلام دنیا کے ایک بڑے حصہ میں بطور  
ایک تبلیغی مذہب کے نسبت عیسوی مذہب کے زیادہ تر کامیاب  
ہے۔ نہ صرف بت پرستی سے اسلام پر ایمان لانے والے نسبت  
عیسائی مذہب پر ایمان لانے والوں کے زیادہ تر ہیں۔ بلکہ  
مذہب عیسائی بعض ملکوں میں درحقیقت اسلام کے سامنے سے  
ہٹتا جاتا ہے۔ اور مسلمان قوموں کو متقربانے کی کوششیں بظاہر  
بالکل ناکام رہتی ہیں۔ اور صرف یہی نہیں کہ ہم وہاں اپنا قدم  
نہیں جما سکتے بلکہ ہم اپنی حفاظت کرنے میں بھی ناکام رہتے  
ہیں مذہب اسلام اس وقت مراکو سے جاوآ تک اور زنگبار  
سے چین تک پھیلا ہوا ہے اور افریقہ میں بے حد تیزی سے پھیلتا  
جاتا ہے۔ انھوں نے کانگو اور زیمبزی میں قدم جمائے ہیں اور  
سیاہ قوم اقوام کی سب سے بڑی ریاست اگنڈا کے باشندوں  
نے اسلام ابھی حال میں قبول کیا ہے۔ ہندوستان میں یورپین  
ہذیب جو ہندو مذہب کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہے (حقیقت  
میں اسلام کے لیے راستہ صاف کر رہی ہے۔ سارے چھپس کر وڑ  
میں سے پانچ کروڑ آدمی ہندوستان میں اس وقت مسلمان  
ہیں (نوٹ۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ تک

پہنچ گئی ہے۔ مولف) اور افریقہ میں آدھے سے زیادہ۔  
 مذہب عیسوی اپنی گرفت میں خوب مضبوط نہیں ہے۔ اور ہندوستان  
 اور افریقہ میں اسلام کے سامنے سے ہٹتا جاتا ہے۔ جیمیکہ کا گے جسنی  
 جو صرف نام کے عیسائی ہیں اور بی ازم زبھوت پریت اور خیالی  
 چیزوں کی پرستش قبول کرتے جاتے ہیں۔ اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ  
 افریقہ کی کوئی قوم جو ایک دفعہ اسلام قبول کر لیتی ہے پھر کبھی بتستی  
 اختیار نہیں کرتی اور نہ عیسائی مذہب کو قبول کرتی ہے۔

اسلام نے تہذیب کی اشاعت میں عیسویت سے زیادہ حصہ  
 لیا ہے۔ جب حبشیوں کی کوئی قوم اسلام قبول کر لیتی ہے تو بھوت  
 پریت کی پرستش۔ توہمات باطلہ۔ مردم خواری۔ انسانی قربانی۔  
 بچہ کشی وغیرہ ان میں سے یکلخت مفقود ہو جاتی ہے۔ وہ لباس  
 پہننے لگتے ہیں۔ ان سے گندگی دور ہو جاتی ہے۔ اور وہ پاک  
 و صاف رہنے لگتے ہیں۔ ان میں حمیت اور خود داری کا احسا  
 پیدا ہو جاتا ہے۔ جہاں نوازی ان کا شمار بن جاتا ہے شراب نوشی  
 کارواج بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ بے حیائی کا ناچ اور مرد و  
 عورت کا قابل اعتراض خلا ملا رہنے کا رواج معدوم ہو جاتا ہے۔  
 عورتوں کی عصمت کی قدر ہونے لگتی ہے۔ کاہلی کی بجائے لوگ محنتی

بن جاتے ہیں امن پسندی اور پرہیزگاری کا ان میں رواج ہو جاتا ہے  
خوں ریزی اور جانوروں اور غلاموں پر سختی اور بے رحمی ممنوع  
ہو جاتی ہے غلامی اور تعدد ازواج کی برائیاں نہایت محدود  
ہو جاتی ہیں۔ وہ انسانی ہمدردی فیاضی اور اخوت کا سبق  
سیکھ لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اسلام جن نیکیوں کی تعلیم دیتا ہے اور نئے  
اقوام ان کو خوب سمجھ لیتی ہیں۔ مثلاً ترک منشیات۔ پاکیزگی  
عصمت۔ انصاف۔ تحمل۔ ہمت۔ فیاضی۔ مہماں فواری۔ صداقت  
اور خدا پر توکل۔

اللہ تعالیٰ کی مرضی پر توکل رکھنے کے لحاظ سے مسلمان ہمارے  
یعنی نمونہ ہیں۔ اسلام نے ممالک مغرب کی تین لعنتوں نشہ بازی  
قمار بازی اور بدکاری کو مٹا دیا ہے۔۔۔۔۔۔  
اسلام حقیقی اخوت اور مساوات سکھاتا ہے۔ یہ سب سے بڑی ثبوت  
ہے جو اسلام غیر مسلموں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ نو مسلم فوراً پندارہ  
کردہ افراد کی برادری کا حقیقی رکن بن جاتا ہے۔“

ریورینڈ کینن آنرک ٹیلر نے اپنے اس مضمون کے شایع ہونے کے بعد  
لندن ٹائمز کو جو ایک چھٹی بھٹی تھی اُس میں لکھا تھا کہ

میرا وہ پہلا فقرہ جس پر بہت اعتراض ہوئے ہیں یہ ہے کہ "یشیا اور افریقہ میں مذہب اسلام بطور ایک تبلیغی مذہب کے نسبت عیسائی مذہب کے زیادہ کامیاب ہے۔ اور ہماری کوششیں مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں بے سود ثابت ہوئیں" میں اولاً اپنی بحث ہندوستان سے شروع کروں گا جہاں کے باشندوں کی نسبت تقریباً صحیح اطلاع ہمارے سامنے موجود ہے۔

۱۸۶۱ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان دس برس میں ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی میں قریباً نوے لاکھ چالیس ہزار کی بڑائی ہوئی (۹۲,۳۰,۰۰۰) یعنی تقریباً پچیس فی صدی کی شرح سے۔ اُس قدر زیادتی کو جو معمولاً پیدائش کی زیادتی اور اموات کی کمی سے ہوتی اگر ہم محسوب نہ کریں تو وہ نو مسلم جو ہندو اور عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں ان کی تعداد تقریباً چھ لاکھ سالانہ ہے مسلمانوں کے یہاں تنخواہ دار و اعظمین نہیں ہیں۔ اور نہ کوئی ان میں بڑی جماعت اس قسم کی ہے جو اپنے مذہب کے پھیلانے میں کمر بستہ ہو۔ پس نو مسلموں کی یہ بڑی تعداد کچھ تو پر جوش مسلمانوں کی انفرادی کوششوں کا اور کچھ مذہب اسلام کی حقیقی کشش کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے باوجود اس تمام رعب و داب کے جو ان کو

ایک ہم مذہب گورنمنٹ کے ہونے سے حاصل ہو اور باوجود اخراجات  
کی اس رقم کثیر کے جو مشنری سوسائٹیوں پر صرف ہوتی ہوگی تعداد  
نے عیسائیوں کی بڑی کھینچا تانی سے نو مسلموں کی تعداد کا دسواں  
حصہ ہو۔

۵  
ایں سعادت بزور بازو نیست  
نہ بخشد خداے بخشندہ

قرآن مجید نے انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے سلسلہ میں جو  
حیرت انگیز کوششیں دکھلائے ان کی ایک دنی مثال یہ ہے کہ امریکا جیسے تہذیب یافتہ  
ملک میں وہاں کی گورنمنٹ نے کئی سال تک جبری قوانین کے ذریعہ سے شراب  
نوشی بند کرنے کی کوشش کی مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ ہندوستان میں  
بہا تارکاندھی جی نے اپنی ساری قوت شراب نوشی کی مخالفت میں صرف کر دی  
اور کر رہے ہیں۔ اور اس کام میں ملک کے ہزار ہا دولتمند اور قابل لوگ ان کی  
مدد میں مصروف ہیں۔ تمام ہندوستان کے مطالع اور اخبارات ان کے ہم آہنگ ہیں  
شہر بنجوری کے راجہ بین کاپے کی کمی کے اضا فہ ہو رہی اور یہ صرف قرآن مجید کی تعلیم کا اعجاز ہے کہ  
صرف شہر بنجوری بلکہ اس سے بھی بدتر فعال قبیلہ ملک عرب سے چند سال کے قبل عرصہ میں تباہ ہو گئے  
اور دنیا بھر کے مسلمان من حیث القوم شراب سے مستقر ہیں۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء

# ساتواں باب

## بعض اُن امور کا ذکر جو انسانی عقل کی گرفتِ باہر ہیں

اس رسالہ میں ہمارے مخاطب صرف مسلمان نوجوان ہیں۔ جو خدا کو مانتے ہیں وحی کے قائل ہیں اور مذہبِ اسلام کے پیرو ہیں۔ ہمارا مقصد ہرگز اُن عقائد سے کج بختی کرنا نہیں ہے جو فوقِ عقل امور کو نہیں مانتے۔

دُنیا میں جہاں اور بہت سے مذہب راجح ہیں ایک مسلک یہ بھی ہو کہ جو بات خود انسان کی سمجھ میں نہ آئے اس کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر یہ عقلی مسلک دیگر مذاہب کی طرح تعمیری ہوتا اور اپنے پیروؤں کے اخلاقی اور مادی نفع کی خاطر اُن کی رہنمائی کے لیے ایک نئی اور مفید تر راہِ عمل تجویز کر کے کوئی جدِ اکابر نہ ہدایت نامہ پیش کرتا تو اس حد تک عقیدہ کا اختلاف چنداں بحث طلب نہ ہوتا۔ مگر یہ مسلک بخلاف دیگر مذہب کے تخریبی ہے اور اس کا مدعا ہے خدا کا یقین زایل کرنے اور مذہب کی عمارت کو منہدم کرنے کی کوشش کرنا۔ اس مسلک کی دو خصوصیتیں توجہ طلب ہیں ایک تو اپنے محاسن کا دوسروں کو یقین دلانے کی پسندت دوسروں کے عقائد کی کمزوری اور نقایص چننا اور اُن پر نکتہ چینی کرنا آسان تر ہے۔ دوسرے



یہ کہ خدا کے یقین اور مذہب کی پیروی سے انسان کے خیالات اور اعمال پر لازمی طور پر بندشیں عاید ہوتی ہیں، اور فطرت انسانی سہولت پسند واقع ہوتی ہے۔ لہذا بندشوں سے رہائی پانے کی خواہش انسان کی فطرت میں غالب ہوتی ہے۔ اور ضروریات زندگی کو مہیا کرنے اور نفسانی رغبتوں کی تکمیل میں وہ چاہتا ہے کہ ہر طرح کی آزادی سے بہرہ یاب ہو۔ اور مادی فوائد کے حصول میں کوئی مزاحمت سبب راہ نہ ہو۔ اس وجہ سے عقلی مسلک میں نا تجربہ کار نوجوانوں کے لئے ایک کشش موجود ہوتی ہے۔ لہذا عقائد کے متزلزل کرنے والے اس خطرہ کو پیش نظر رکھ کر محض حفاظت خود اختیاری کے طور پر بعض فوق العقل عقائد پر تھوڑی سی روشنی ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔

### ”خدا“

جس طرح یہ ایک قانون قدرت ہے کہ گرمی سے جسم پھیل کر زیادہ جگہ گھیرتا ہے اور سردی پا کر جسم سکڑتا ہے اور کم جگہ گھیرتا ہے اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہم کسی چیز سے بغیر دیکھے نہ تو ڈرتے ہیں نہ اس کی طرف رغبت کرتے ہیں۔ مگر دنیا کے کلیہ قاعدے استثنائے خالی نہیں ہوتے۔ اور جس طرح مذکورہ بالا قانون قدرت کے خلاف بطور امر واقعہ برف باوجود پانی سے سرد تر ہونے کے ہلکا ہوتا ہے اور پانی کی نسبت زیادہ جگہ گھیرتا ہے

اسی طرح یہ بھی امر واقعہ ہے کہ تقریباً ساری دنیا اور غالباً تمام ہی نوع انسان کا یہ متفقہ  
میلان ہے کہ کم از کم ایک نا دیدہ ہستی کی طرف انسان کی رغبت ہے۔ اور رغبت  
بھی ایسی کہ اور تمام رغبتوں سے فائق۔ اسی ایک نا دیدہ ہستی کا خوف بھی ہے  
خوف بھی ایسا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی ایسی خوفناک نہیں۔ وہ اسے دیکھ  
نہیں سکتے لیکن جو کچھ بھی دیکھتے ہیں اس میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے اور جس کو  
دیکھتے ہیں اس کے وجود میں شک کریں تو کریں لیکن جس کا نور آنکھوں میں  
سما رہا ہے اس پر بے دیکھے ایسا یقین ہے کہ اس کے خلائق ہزار جنتیں ہیں  
لاکھ دلیلیں بیان کی جائیں اور انسان عقلی طور پر جواب دینے سے عاجز  
آجائے مگر یہ یقین فنا نہیں ہوتا۔ اور یہ اعتقاد زائل نہیں ہوتا۔

آنکھیں تھک کر ڈھونڈتی ہیں دل اگر دیدہ ہے جلوہ پیرا دیدہ ہے صورت تیری نا دیدہ ہے  
بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ میں جلوہ آشکار اس پہ گھونگھٹ یہ کہ صورت آج تک دیدہ ہے  
یہ اعتقاد جاہل اور عالم عامی اور عارف ہر شخص کے دل پر کم و بیش  
قبضہ کیے ہوئے ہے۔ اور دنیا کا کوئی حصہ اور زمانہ کا کوئی عرصہ ایسا مستحق نہیں  
ہوتا جس میں لوگ اس یقین سے قطعاً بے بہرہ رہے ہوں۔ اس لیے کہا جاسکتا  
ہے کہ یہ یقین عقل و استدلال سے پیدا نہیں ہوا۔

ہستی باری تعالیٰ کا عقیدہ اگر استدلال پر منحصر ہوتا تو جاہل قوموں میں نہ پایا  
جاتا۔ بلکہ تہذیب کے ابتدائی مراتب میں بھی اس کا وجود نہ ہوتا۔ حالانکہ

واقعیت اس کے خلاف ہے اور جہلا کے دلوں میں جس وثوق اور اطمینان کے ساتھ یہ یقین موجود ہوتا ہے وہ بسا اوقات علما کے لئے قابل رشک ہوتا ہے اس لئے صاف ظاہر ہے کہ اگر وجود باری تعالیٰ کا یقین عقل و استدلال پر موثوث نہیں اور باوجود اس کے ہر زمانہ اور ہر ملک میں اس عموم کے ساتھ پایا جاتا ہے تو ضرور ہے کہ فطرت انسانی میں دیگر فطری خواہشوں کی طرح یقین بھی ازل سے ودیعت کیا ہوا ہے۔

ایک صاحب بحث کرتے ہیں کہ انسان اپنی جہالت اور وحشت کے زمانہ میں اکثر چیزوں سے خوف کھاتا ہے اور بعض مناظر کو دیکھ کر پسند کرتا ہے کبھی کسی بلا میں مبتلا ہو کر بایں و ناامیدی کا شکار ہوتا ہے کبھی بے انتہا لذت پاتا ہے اور فرط مسرت سے بے اختیار ہوتا ہے مگر اپنی نادانی اور جہالت کے سبب سے ان مناظر کے مادی اسباب و علل معلوم نہیں کر سکتا۔ اور قوانین قدرت کو نہ جاننے اور نیچر کے بے انتہا وسائل کو نہ سمجھنے کے سبب اپنے دل کو تسکین نہیں دے سکتا۔ اور فرط حیرت سے ان کو کسی مخفی کارکن اور غیر محسوس طاقت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اور روح۔ دیوتا۔ خدا۔ وغیرہ مبہم الفاظ سے اپنی دانست میں قدرت کا راز دریافت کرنے کا دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ یہی خیال باپ سے بیٹے تک متواتر چلا آتا ہے۔ پھر ایسے لوگوں میں سے بڑی

سمجھ بوجھ کے لوگ یا حکام اور مذہبی پیشوا لوگوں کو اپنی اطاعت میں رکھتے اور ان سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کی غرض سے اس خیال کو قوی کرتے رہتے ہیں اپنے معبودوں کی عبادت کے قاعدے قانون بناتے رہتے ہیں۔ غرض لوگوں کے غلط خیال اور بے جا خوف اور امیدوں سے ان کی جہالت کا نتیجہ یعنی مذہب پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے۔

ان کے نزدیک جو فطری اسباب خدا کا خیال اور مذہب پیدا کرنے کے باعث ہیں مثلاً عجائبات عالم۔ اور باعث تکلیف یا باعث لذت اشیا کا دیکھنا۔ انسان چونکہ اپنی جہالت کی وجہ سے ان کے مادی اسباب اور غلط معلوم نہیں کر سکتا لہذا غور و فکر کرنے کے بعد بطریق استدلال اپنی نادانی سے خدا اور دیوتا کے وجود کا غلط نتیجہ نکال لیتا ہے لیکن اگر خدا کا تصور اور مذہب کا خیال جہالت اور نادانی کے سبب غلط استدلال کا نتیجہ ہوتا تو جیسا دوسرے غلط استدلالوں کی حالت ہے تمدن اور تہذیب کی ترقی سے اس کی غلطی معلوم ہونے لگتی اور بقول ان کے جوں جوں قوانین قدرت اور نیچر کے بے انتہا وسائل کا علم ہوتا جاتا اس غلط استدلال کا ضعف ظاہر ہوتا رہتا اور بتدریج خدا کا خیال اور مذہبی احساس کم ہوتے ہوتے بالکل فنا ہو جاتا۔ کم از کم مذہب قوموں میں سے یہ خیال اور احساس نابود ہو جاتا جیسا کہ بہت سے اور خام عقائد کا حشر ہوا۔ مثلاً انسانی قربانی سستی ہونے کی رسم یا بادشاہوں کی

مطلق العنانی اور ان کے ناقابل اعتراض آسمانی اختیارات رفتہ رفتہ نابود ہو گئے مگر خدا کے تصور اور مذہبی احساس کی کیفیت ہے کہ اول تو ان کے خلاف تلاش کرنے والوں کو آج تک کوئی ایسی قوی دلیل دستیاب نہیں ہوئی جس سے وجود باری تعالیٰ ناممکن ثابت ہو سکے۔ چنانچہ مسٹر چارلس بریڈ لاجو وجود باری کے انکار میں نہایت سرگرم تھے مگر جن کو ممبر پارلیمنٹ بن جانے پر شرکت پارلیمنٹ سے قبل حلف اٹھانے کی شرط پوری کرنی پڑی اپنی کتاب "فری ٹھنکرز سکیٹ بک" Free thinkers Text book مطبوعہ ۱۸۸۲ء کے صفحہ ۱۱۸ پر لکھتے ہیں کہ

منکر خدا یہ نہیں کہتا کہ خدا نہیں ہے۔ بلکہ یوں کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ لفظ خدا سے تمہارا کیا مطلب ہے اور میرے دماغ میں خدا کا خیال موجود نہیں ہے۔ اور لفظ خدا میرے نزدیک ایسی آواز جو کبھی کوئی صاف اور معین مطلب نہ ہو۔ میں خدا کا انکار نہیں کرتا۔ کیونکہ جو چیز میرے تصور میں نہیں اور جس کا تصور ماننے والوں کے دماغ میں بھی ایسا ناممکن ہے کہ وہ اس کی تعریف و تحدید نہیں کر سکے۔ ایسی چیز کا انکار کیونکر کر سکتا ہوں؟

دوسرے جس چیز کو وحشیانہ خوف اور تعجب کی پیدائش مانا گیا تھا اس میں بجائے ضعف اور شک پیدا ہونے کے اور بجائے آہستہ آہستہ فنا ہو جانے کے جیسا کہ

دیگر غلط استدلالوں کا حشر ہوا تمدن اور تہذیب کی ترقی سے اُس میں اور جلا  
 آتی گئی۔ اور قوانین قدرت اور نیچر کے بے انتہا وسائل سے شناسائی ہوتے جانے  
 سے اعتقاد اور ایمان کا راستہ زیادہ صاف ہوتا گیا۔ پہلے زمانہ میں جہلا کسی  
 عجیب درخت اور خوبصورت پتھر یا کالما مد حیوان کو دیکھ کر اپنا مذہبی میلان  
 اُس طرف متوجہ کر دیتے تھے اور ان کو خدا مان کر پرستش کرنے لگتے تھے۔ اُس کے  
 بعد جب کثرت مشاہدہ اور عقل و شعور کی ترقی سے ان چیزوں کے خواص  
 دریافت ہونے شروع ہوئے تو اُن کو چھوڑ کر جسمانییت سے بعید اور  
 روحانیت سے قریب تر طاقتوں کو خدا ماننے لگے مثلاً بارش کا دیوتا۔ ہوا  
 کا دیوتا۔ سورج کا دیوتا۔ رفتہ رفتہ ایک ایسی ہستی کی طرف متوجہ ہونے  
 کی اُن میں استعداد پیدا ہو گئی جس کی کوئی مثال نہیں۔ نہ اُسے نظر نے  
 دیکھا نہ علم کی اُس تک رسائی ہو۔

مسٹر چارلس بریڈلا کا یہ قول صحیح ہے کہ خدا کا وجود اُن کے تصور کی گرفت  
 سے باہر ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس وجود کا سراغ مسٹر بریڈلا  
 مجر و اپنی عقل و تصور کے ذریعہ سے نہ پاسکے اُس کا پتہ اور کسی ذریعہ سے  
 بھی نہیں حل سکتا۔

مسٹر کارلائل نے لکھا ہے اور سچ لکھا ہے کہ

ہستی کا خوفناک مگر شاندار راز اُن پر (یعنی حضرت محمد پر) منکشف

ہو گیا تھا۔ ابتدا میں سفر اور حضر میں ہزاروں خیالات کا ان کے دل میں ہجوم تھا۔ میں کیا ہوں؟ یہ دنیا کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں کس عقیدے کو مانوں؟ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ یہ ایسے سوالات تھے کہ ہیبت ناک کوہِ حرا کی چٹان اور غارِ حرا کی ہولناک خاموشی اور تنہائی اور وہ بڑے بڑے اجرامِ فلکی جو خاموشی کے ساتھ نیلی اور روشن آسمانی فضا میں گردش کرتے رہتے ہیں ان کا جواب نہیں دے سکے۔ مدتوں ان سوالات کا کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر خدا کے الہام نے عقدہ کشائی کی اور آسمانی تائید کی بدولت محمدؐ نے جو نظامِ قائم کیا اُس کے نتائج دنیائے دیکھ لیے۔“

مشہور مورخ ہر سٹراپڈور وین (مصنف تاریخ زوال سلطنتِ رومۃ الکبریٰ) نے مسٹر کارلائل کے مذکورہ بالا قول کی اس طرح تصدیق کی ہے کہ ”ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اُس کی صفات پر اعتقاد رکھتا ہو مسلمانوں کے مذکورہ بالا عقیدہ کی نسبت یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ایسا عقیدہ ہے جو ہمارے موجودہ ادراک اور قوائے عقلی سے بڑھ کر ہے اس لئے کہ جب ہم نے اُس نامعلوم چیز (خدا) کو زبانِ مکانِ حرکت اور مادہ جس اور تفکر کے اوصاف سے مبرا کر دیا تو

پھر ہمارے خیال کرنے اور سمجھنے کے لیے کیا چیز باقی رہ گئی  
وہ اصل (یعنی توحید ذات و صفات باری تعالیٰ) جس کی  
بنیاد عقل اور وحی پر ہی محمد کی شہادت سے استحکام کو پہنچی۔  
چنانچہ اس کے معتقد ہندوستان سے لیکر مراکو تک موحد کے

لقب سے ممتاز ہیں۔“

مسٹر چارلس بریڈلا، مسٹر ٹامس کارلائل اور مسٹر ایڈورڈ گہن  
تینوں انگلستان کے باشندے ہیں عقیدہ کے اس اختلاف کی بنا پر اگر کسی  
عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں جہاں واقعات اور معتبر شہادتوں کی بنا پر منصفانہ  
کا فیصلہ ہوتا ہے تو اول الذکر کسی طرح اپنے سے زیادہ ناموران ڈومہوطنوں کے  
مقابلہ میں کامیاب نہ ہوں۔

قرآن مجید کی بتلائی ہوئی ذات باری کے وجود کی ایک ممتاز  
خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس لاشریک ذات کے لیے اللہ کا ایک ایسا  
اہم ذات بتلا دیا گیا ہے جو بجز اس خالق کائنات اور معبودی کے کسی اور  
ہستی اور وجود کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ  
عربی زبان کے سوا اور کسی زبان میں باری تعالیٰ کا کوئی اسم ذات موجود  
نہیں ہے۔

مسٹر چارلس بریڈلا اور ان کے ہم خیال عقلا اور ماہرین سائنس



کی خدمت میں ادب سے گزارش ہو کہ آپ صرف اس وجہ سے کہ دور دراز اجرام فلکی سے دوسرے اجرام فلکی تک روشنی اور حرارت پہنچنے کی کوئی صورت آپ کی عقل میں نہیں آتی۔ لہذا آپ ایک بے دیکھی اور بے سمجھی مجہول شے ایٹھرا کا وجود جس کا کوئی صاف اور عین مفہوم آپ کے ذہن میں نہیں زبردستی تسلیم کر لیتے ہیں یہ ایمان بالغیب نہیں تو اور کیا ہو۔ چونکہ قطب نما کی مقناطیسی سوئی کا ہمیشہ شمال و جنوب رخ رہنا آپ کی سمجھ میں نہیں آتا اس لیے اپنے دل کو سمجھانے کے لیے آپ زمین کے اندر ایک بے دیکھے اور بے سمجھے فرضی مقناطیس کا وجود اور زمین کے چاروں طرف شرقاً غرباً بجلی کی ذرئی رو کا وجود بے تکلف مان لیتے ہیں۔

وہ کڑوروں سیارے اور ستارے جن کے وجود کے آپ قائل ہیں مگر جن کی حقیقت اور جن کے حالات کا آپ کو مطلق کوئی علم نہیں اور جو فضا سے آسمانی میں اپنے اپنے مقررہ حلقوں میں رات دن گردش کرتے رہتے ہیں ان کا نظام اور فضا میں معلق رہنا آپ کی عقل کی گرفت سے باہر تھا۔ آپ نے چند حکما کی رائے کے مطابق ایک ایسی بے دیکھی بے سمجھی مجہول قوت کشش باہمی کا وجود وحوشی سے قبول کر لیا جو آپ کے مشاہدے اور تجربہ کے حدود سے خارج ہو۔ آپ نے آج تک چند متناسب الاوزان اجسام کے نمونے بنا کر بطور تجربے کے بھی نہیں دکھلائے جو کشش اتصال کے ماتحت

فضا میں تھوڑی سی دیر کے لیے متعلق رہیں۔

زمانہ سابق کے ماہرین فلکیات نے اجرام فلکی کے نظام اور ان کی گردش کی بالکل دوسری صورت قرار دے رکھی تھی جس کی صحت پر صدیوں تک لوگوں کو ایسا ہی کامل یقین تھا جیسا کہ آج کل کی تحقیقات پر ہر کوشش نقل و اتصال اگرچہ کسی قدر ہمارے ذہن کی گرفت میں ہے۔ مگر پھر بھی اس خیال کو بالکل مشخص اور معین کر لینا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ خود مسمر انزک بیوسن تسلیم کرتے ہیں کہ کوشش نقل و اتصال ناقابل فہمیدگی اگر درمیان میں ایٹھ کا واسطہ نہ ہوتا مگر ایٹھ کو مان کر بھی کوشش کا اثر سمجھ میں نہیں آتا صرف نامعلوم کو معلوم سمجھ لیا گیا ہے۔ اور علت لعلل کو چھوڑ کر سائنس نے بت پرستوں کی طرح برق۔ حرارت کوشش اتصال۔ کوشش نقل۔ انرجی وغیرہ متعدد نامعلوم الحقیقت علیتیں تسلیم کر رکھی ہیں جنکی بابت کچھ معلوم نہیں کہ یہ خود کہاں سے آئیں اور کیونکر آئیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ناقابل فہمیدگی کو قابل فہمیدگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذہب کا بنیادی اصول ہے ”توحید“ اور دوسرے کا تعدد اسباب کا گورک و ہند ہے۔

اب ذرا ان عقل پرستوں کے تحقیق کیے ہوئے اسباب کی حقیقت پر نظر ڈالیے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ گھڑی کو صاحب ارادہ اور صاحب فہم

انسان اپنی قوت سے گونگتا ہے۔ فزک کو انسانی قوت کے ساتھ کوکنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ غیر متحرک بالکمانی میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے جب کوک ختم ہو جاتی ہے تو اُس کے نتیجے کے طور پر بال کمانی کی حرکت بھی خود بخود بند ہو جاتی ہے بالکمانی کی حرکت کا بند ہونا گھڑی کے بند ہونے کا سبب نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسانی تدبیر کی بدولت حرارت اور بھاپ کے ذریعہ سے اجن کا پسٹن حرکت کرتا ہے اُس سے اجن چلتا ہے۔ جب حرارت اور بھاپ ختم ہو جکتی ہے تو پسٹن بطور نتیجے کے رُک جاتا ہے۔ پسٹن کا رُکنا اجن کی رفتار بند ہونے کا سبب قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دنیا کی ابتدا سے آج تک ایسا کھلونا ایجاد نہیں ہو سکا جس میں بغیر انسانی تدبیر اور قوت کے خود بخود حرکت پیدا ہو جاتی ہو اور جب تک کسی رکشاپ میں ہم مشاہدہ اور تجربہ سے یہ نہ دیکھ لیں کہ بغیر جاندار وجود کی مدد غلت کے ہر حالت میں خود بخود حرکت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک حرکت کو مادی ذرات کا ایک خاصہ یا کسی وجود کے عناصر کی نامعلوم خاص قسم کی خست کا نتیجہ قرار دینا بالکل ایک فرضی اور ناقابل قبول تاویل سمجھی جائے گی۔ جو بقول مسٹر بریڈلا کے انسانی تصور سے خارج ہے۔

چونکہ موت اور حیات کے مسائل عقل انسانی کی گرفت سے وٹا باہر ہیں لہذا اس صدی کا ایک ڈاکٹر موت کا سبب نہ معلوم کر سکنے کی وجہ سے

کہتا ہے کہ فلاں شخص قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے مر گیا آپ نہایت بھولے پن سے اس بے دلیل اور غیر آزمودہ قول پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ قلب کی حرکت کا بند ہو جانا موت کا نتیجہ ہونا چاہیے نہ کہ موت کا سبب۔

اگر مجر و قلب کی حرکت نسبت کا سبب ہوتی تو قلب کو برقی قوت کے ذریعہ سے متحرک رکھنا چنداں مشکل کام نہ تھا آخر یہ قلب پہلے کیوں حرکت کرتا تھا اور رفتاباں کرتے کرتے خود بخود کیوں بند ہو گیا۔ حالانکہ سائنس کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ نہ تو ساکن شیخ خود بخود حرکت میں آسکتی ہے نہ متحرک شیخ بغیر خارجی اسباب کے خود بخود ٹھہر سکتی ہے۔

ایک معمولی آدمی کہتا ہے کہ وہ آدمی موت سے مر گیا۔ ڈاکٹر کا قول ہے کہ قلب کی حرکت بند ہو جانے سے مر گیا۔ ان دونوں اقوال میں عملاً کیا فرق ہے؟ دونوں ایک بے سمجھا اور عقل و حکمت کی گرفت سے باہر ایک ایسا سبب تجویز کرتے ہیں جو دونوں کے قابو سے یکساں باہر ہے۔ اور دونوں اس واردات کی روک تھام سے یکساں عاجز ہیں۔

دنیا کے ایک سب سے بڑے زبردست بادشاہ کے پہلو میں درد اٹھتا ہے اس کے چاروں طرف کھڑے ہوئے دنیا کے ہر حصہ سے آئے ہوئے بڑے بڑے نامور ڈاکٹر اور طبیب غور سے اس کی حالت اپنی آنکھوں سے

دیکھ رہے ہیں۔ نہایت لطیف آلے تشخیص مرض کی غرض سے استعمال ہو رہے ہیں۔ نہایت قیمتی ادویات سے کام لیا جا رہا ہے۔ مگر بادشاہ سلامت بدستور دروسے تڑپ رہے ہیں اور یہ تمام ڈاکٹر اور طبیب بالکل سبکیں اور عاجز ایک معمولی بیمار دار کے مانند خاموش کھڑے ہیں۔ نہ مرض سمجھ میں آتا ہے نہ کوئی چارہ کار سوچتا ہے۔ بادشاہ اسی حالت میں مر جاتا ہے اب اس کے مرنے کے بعد ڈاکٹر صاحبان نہایت اطمینان سے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کی موت کے وجوہ قرار دے کر اخبارات میں شایع کرتے ہیں کہ ہنر محبشی کا فلاں من سے انتقال ہو گیا۔ جس طرح صوبہ بہار کے بھونچال کی حشر انگیزیاں ختم ہونے کے بعد عقلا اس کے اسباب کے متعلق اب قیاس آریاں فرما رہے ہیں۔ گویا یہ حضرات اس بھونچال کی ماہیت اور اسباب اس طرح سمجھ گئے ہیں کہ اب دنیا میں کبھی بھونچال آنے ہی نہ پائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موت کے راز سے حکما اور عقلا اسی قدر ناواقف ہیں جس قدر زیست کے راز سے۔

آنحضرت صلعم پر بذریعہ وحی کے جو آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کی سب سے بڑی صنعت خالقیت کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے جو اس کی عقل و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جس کا راز نہ آج تک کسی حکیم نے سمجھا ہے اور نہ آئندہ کوئی سمجھے گا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ كُوْنِيْ ذَكْرًا اَوْ كُوْنِيْ طَبِيْبًا يَّهْدِيْ بِرَبِّكَ اِسْرَاحَۃً

نہیں سمجھا سکتا کہ اُس کا کوئی معین تصور یا مفہوم دماغ انسانی میں سما جائے  
 کہ مرد اور عورت کے تخم ہائے انسانی ایک جگہ ہونے کے بعد ایک غیر متحرک  
 اور منجھ خون کا اوٹھڑا بن کر اُس سے متحرک جان دار اور سمجھدار انسان کیونکر  
 بن جاتا ہے۔ نامعلوم کو معلوم ثابت کرنے کی غرض سے جس قدر تاویلات کی جاتی  
 ہیں وہ بے ثبوت اور بے یقینہ اور انسانی عقل کی گرفت سے باہر ہیں۔  
 کبھی مچھڑ اور چوٹی بنا تا تو ہر ایک طرف کسی نے آج تک ایک سیدھا  
 سا وہ متحرک برساتی کیڑا بھی بنا کر نہیں دکھلایا۔ جو ماہر فن مصور ایک چرٹیا  
 کی تصویر نہ کھینچ سکے جو بڑھی ایک اسٹول نہ بنا سکے جو سنار ایک چھلانہ  
 گھڑ سکے جو لوہار ایک لوہے کی کیل بنا بھی نہ جانتا ہو ان حضرات کا اپنے  
 اپنے فن کے متعلق اصول اور نظریے بیان کرنا اور منطقی دلائل سے اپنے نظریوں  
 کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا ان کی فنی واقفیت کا کسی کو یقین نہیں  
 دلا سکتا۔ ان کی جو دت طبع کی داد دی جا سکتی ہے مگر ان فنون سے حقیقت میں  
 وہ اسی قدر ناواقف ہیں جتنا کہ ایک بے پڑھا لکھا دیہاتی۔ اسی طرح  
 اطباء سے جدید کا یہ دعوے کہ وہ زیست اور موت کے اسباب سمجھ گئے  
 ہیں۔ حالانکہ نہ وہ ایک متحرک کیڑا بنا کر دکھلا سکتے ہیں نہ وہ ایک سیلرگ  
 کیڑے کی موت ملتوی کر سکتے ہیں۔ تو علمی دنیا ان میں اور ایک جاہل ہیں  
 کوئی تمیز نہیں کر سکتی ایک نامور شاہی طبیب سے کسی نے سوال کیا تھا کہ آپ

مریضوں کا علاج کرتے ہیں اور فلاں عطار بھی علاج کرتا ہے۔ آپ کے علاج سے  
 بھی کچھ مریض شفا یاب ہو جاتے ہیں اور کچھ مر جاتے ہیں۔ اور اُس عطار کے علاج  
 سے بھی کچھ مریض اچھے ہو جاتے ہیں اور کچھ جانبر نہیں ہوتے۔ اسی صورت  
 میں آپ میں اور اُس عطار میں کیا فرق ہے۔ حکیم صاحب اس کا صرف یہ جواب  
 دے سکے وہ مریضوں کو بے ضابطہ مارتا ہے اور میرے مریض ضابطہ کے اندر  
 مرتے ہیں اسی طرح جو حکیم یہ بتلاتے ہیں کہ انڈے سے بچہ اس طرح بنتا ہے اور  
 منجہ خون کے لو تھڑے سے آدمی اس اس طرح بن جاتا ہے ان کی موت و  
 زیست کی حقیقت سے ناواقفیت "طلای" کہی جاسکتی ہے اور معمولی کسان کی ناواقفیت  
 کو "گلی" قرار دے سکتے ہیں۔ ورنہ جس طرح اسپین اور ہانڈ روجن ملا کر پانی بنا کر  
 دکھلا دیتے ہیں اسی طرح جب تک ایک متحرک جاندار کیرا یا مصنوعی انڈے سے  
 مرغی کا بچہ نکال کر نہ دکھلا دیں ان کے علم کا دعویٰ غیر معتبر رہے گا۔

اب آخر میں عقلی مسلک کے پیروں سے ہمارا ادب سے یہ سوال ہے کہ  
 حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان  
 تاریخی ہستیاں ہیں۔ فرضی وجود نہیں ہیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی رہنمائی  
 کی ہے۔ اور جن کے نام کی عظمت کرنے والوں اور جن کی ہدایات پر عمل  
 کرنے والوں سے دنیا بھری ہوئی ہے انہوں نے خدا کے وجود سے آگاہ  
 ہو کر خود بھی اُس کی پرستش کی اور اپنی اُمتوں سے بھی اُس کی پرستش کرائی

کیا یہ سب کھیل تھا۔ شہدہ بازی تھی۔ فریب تھا۔ مصالحت کتنی یا جھوٹ تھا  
 کیسی بے انصافی اور ضد کی بات ہو کہ مثلاً سراسر انکریشن کا نظریہ  
 (کٹیوریٹی) **theory** ایک مشاہدہ اور سمجھ میں نہ آنے والی قیاسی  
 اور محمول بحقیقت کیشش اتصال کی بابت ماننے کے لیے ہمارے عقل پرست  
 بزرگ تیار ہیں۔ مگر سچے اور راست باز پیغمبروں کے بتلائے ہوئے مشاہدہ  
 اور تجربہ پر مبنی واقعات (فیکٹ) **Fact** کا صاف انکار۔

جب موت وزیست کے پیش نظر واردات کو حکما نہیں سمجھ سکتے اور  
 اس میں مدخلت کی قدرت نہیں رکھتے تو خدا کا جو کہ ہر قسم کی تعبیرات سے  
 مبرا ہے اس کا عقل انسانی کی وسعت میں نہ سما سکتا کو سنی انوکھی بات ہے  
 جو لوگ ایٹمز، برق، انرجی کیشش ثقل و اتصال وغیرہ کے بن دیکھے  
 عقلی وجود کو جن کی حقیقت اور جن کی علت سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ آسانی تسلیم  
 کر لیتے ہیں۔ اور نامعلوم کو معلوم سمجھ لیتے ہیں ان کی زبان سے خدا کے وجود

کا انکار کم سے کم تعجب انگیز ضرور ہے۔  
 فلسفی حقیقت تو بہت کشتو و گشت راز و گراں از کہ افتائے کرد  
 وحی

یہ امر واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر پورا ایمان نہیں ہو سکتا جب تک وحی  
 پر ایمان نہ ہو۔ وحی الہی خالق اور مخلوق کے درمیان سچا تعلق پیدا کرتی ہے



اور اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل صرف وحی کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ ذاتِ باری  
 کا یقین استدلال سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ عقل ایسے جوہر کو پیدا کرنے کے  
 قابل نہیں۔ بڑے بڑے نامور حکیم اور فلسفی سقراط۔ افلاطون اور ارسطو وغیرہ  
 عقل کی رہنمائی سے بت پرستی کی گمراہی پہچان سکے مگر ان کی عقل کی پرواز کچھ نہیں  
 توحید کے اعلیٰ مقام تک نہ پہنچا سکی۔ چنانچہ ان حکماء نے کسی صراطِ مستقیم کا سراغ  
 نہ پایا۔ اور وہ اپنے شاگردوں کے واسطے کوئی دینی مسلک تجویز نہیں کر سکے۔ اسی  
 وجہ سے کوئی مذہب ان سے منسوب نہیں ہے۔ خالی نظارہ قدرت سے  
 انسان یہ اقرار کر سکتا ہے کہ قدرت یا مناظر قدرت کا کوئی صنایع ہے۔ مگر اس  
 نظارہ سے وہ یقین پیدا نہیں ہوتا جس سے عمل کی قوت پیدا ہوتی ہے  
 جس کے نمونے آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہؓ نے دُنیا کے سامنے پیش کیے  
 اور جن نمونوں سے دُنیا کبھی خالی نہیں رہی۔ غرض ایسا ایمان عقل انسانی  
 کی رسائی سے باہر ہے۔ وہ صرف اس تعلق کے قائم ہونے سے پیدا ہوتا ہے جو  
 فی الواقع خالق اور مخلوق میں ہے اور اس کے حصول کا واحد ذریعہ وحی الہی ہے  
 وحی کے متعلق انجمنستان کے دو فاضل اور نامور محققوں مسٹر کار لائل  
 اور مسٹر ایڈورڈ کین کا یہ اعتراف اور پر نقل ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ  
 کے وجود اور اس کے صفات کا عقیدہ انسان کے اور اک اور قوائے  
 عقلی کی رسائی سے بلند تر ہے۔ اور یہ کہ توحید ذات و صفات باری تعالیٰ

کالیقین حضرت محمدؐ کی شہادت سے استحکام کو پہنچا۔

بطاہر انسان کی جملہ معلومات کا دار و مدار صرف اس کے حواس خمسہ پر جو جن کے پانچ آلے آنکھ، ناک، کان، زبان اور جسم انسان کے قبضے اور تصرف میں ہیں جس وقت ہمارے حواس کے یہ آلے کام نہیں دیتے اس وقت ان حواس سے اعلیٰ ترقوت یعنی عقل انسان کی رہنمائی کرتی ہے مثلاً آنکھ جو بینائی کا آلہ ہے سب سے زیادہ دور رس اور سب سے زیادہ کارآمد آلہ ہے جو تجربہ کی بدولت باقی اور چاروں آلوں کا کام بھی دے دیتا ہے لیکن یہی آنکھ ہوا کو بھاپ کو اور گھڑی کی سوئی کی رفتار کو محسوس نہیں کر سکتی سیاروں اور سیارہ دیوار کی حرکت بھی نہیں دیکھ سکتی۔ نیز بغیر مادی اجسام کی موجودگی کے فضا میں روشنی کے وجود کا بھی احساس نہیں کر سکتی۔ ان مواقع پر حواس سے برتر عقل رہنمائی کرتی ہے اور علم کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی طرح عقل سلیم جن امور کے ادراک سے عاجز ہوتی ہے یا ان کے متعلق غلط حکم لگاتی ہے تو اس سے بھی اعلیٰ ترقوت انسان کی رہنمائی کرتی ہے اور وہ یا تو قوت ایمانی ہوئی ہے یا کشف اور وحی حضرت انسان جن کو اپنی عقل پر اتنا ناز ہے کہ خدا کو خدائی سے معزول کرنے پر تلے ہوئے ہیں خود ان کی حقیقت یہ ہے کہ آپ نظام شمسی کے ایک چھوٹے سے سیارے پر آباد ہیں رخیب سے آپ تنا جانتے ہیں اس نظام شمسی میں زمین سے بہت بڑے بڑے سیارے موجود ہیں جن تک آپ کی عقل

نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس وجہ سے اُن کا آپ کو کوئی علم نہیں ہے۔ آپ کے زعم میں ان عظیم الشان سیاروں پر کوئی مخلوق آباد نہیں ہے بلکہ خالی ہندو کی طرح آفتاب کے گرد محض اس وجہ سے چکر لگاتے رہتے ہیں کہ زمین پر رہنے والے چند نفوس کبھی کبھی دورین کے ذریعہ سے (بشرطیکہ ابرمحیط آسمان نہ ہو) اُن کی سطح کا کوئی حصہ دیکھ کر قیاس آرائیاں کیا کریں۔ اسی پر بس نہیں۔ آپ کو یہ بھی تسلیم ہو کہ اس نظام شمسی جیسے اور سیکیڑوں نظام شمسی فضا میں تیر رہے ہیں۔ جن تک دور بینوں کی بھی رسائی نہیں ہو۔ عرض عالم کی وسعت کے لحاظ سے حضرت انسان کی حیثیت ایک گولر کے ٹھنگے، یا کنویں کی میٹھک سے زیادہ نہیں، مگر دعویٰ یہ ہے کہ جو بات آپ کی عقل میں نہ سماے وہ نامکن اور محال۔

خیر یہ تو دور کی باتیں تھیں۔ حضرت انسان کو خود اپنے گھر کی خبر نہیں کہ آپ کو اپنے جسم سے کیا تعلق ہے۔ آپ جس چیز کو "میں" سے تعبیر کرتے ہیں خود آپ کو اپنی اس "میں" کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ جب آپ کا وزن چند سیر تھا تب بھی آپ اپنے آپ کو "میں" فرماتے تھے۔ اور جب جوانی میں میں آپ تین من بچتے ہو گئے تب بھی آپ وہی "میں" رہے۔ آنکھ، کان، ناک سب جاتے رہے۔ ایک بازو کٹا۔ دوسرا بازو کٹا۔ ایک ٹانگ کٹی دوسری کٹی صرف لو تھڑا باقی رہا مگر اس میں جان ہے تب بھی آپ "میں" میں کوئی

فرق نہیں آیا۔ لہذا آپ کے جسم کا کوئی جزو یا کل جسم جو ہمیشہ گھٹنا بڑھتا اور تبدیل ہوتا رہتا ہے "میں نہیں تو پھر آخر یہ دو میں" آپ کس چیز کو کہتے ہیں۔ آپ سو رہے ہیں۔ آپ کے پانچوں حواس معطل ہیں۔ آپ کی آنکھیں بند ہیں۔ کوئی آپ کا نام لیکر پکارے تو کان نہیں سنتے۔ جسم کو کوئی چھوتا ہے تو آپ کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح ذائقہ اور شامہ بھی دونوں معطل ہیں مگر آپ کلکتہ کی سیر میں مصروف ہیں۔ آنکھیں کان۔ ناک وغیرہ سب اپنا اپنا کام نہایت مستعدی سے دے رہے ہیں۔ یہ سیر کرنے والے کون ہیں۔ یہ نئے نئے حواس خمسہ کہاں سے آگئے اور ان کے آلے جسم کے کس حصہ میں پہنچاں تھے ان کی کچھ خبر نہیں۔ خواب کی ہزار کوئی تاویلیں آپ کو سمجھائے مگر بہت سے ایسے خواب نکلیں گے مثلاً آئندہ پیش آنے والے واقعات کا قبل از وقوع مشاہدہ یا اطلاع ہو جانا وغیرہ جو ان تاویلات کے احاطہ سے باہر ہیں۔ جسم جوں کا توں مگر آپ مر جاتے ہیں۔ اس واردات کی حقیقت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ آپ میں کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ ماں کے پیٹ کے اندر آپ کے غیر متحرک ابتدائی جرم میں کیا نئی چیز داخل ہو گئی جس نے آپ کو متحرک کر دیا۔ اور کیا چیز آپ میں سے کم ہو گئی کہ آپ مر گئے۔ علمالاکھ آپ کی اس تعمیر و تخریب کے طریقے سمجھائیں مگر حقیقت میں اس بھید سے ناواقف ہیں۔ اگر ان کو واقفیت ہوتی تو اس تعمیر و تخریب میں کچھ دست اندازی

کر سکتے بگریہ دونوں وارداتیں (زیست اور موت) ان کے دسترس سے بالکل باہر ہیں۔ اگر یہ راز فی الحقیقت ان کی سمجھ میں آگیا ہوتا تو کم سے کم ایک برساتی کپڑا یا پانی کی جونک بنا کر دکھاتے۔ جن کی ساخت بہت سادہ ہے۔ یہ بتلانا آسان ہے کہ جرمنی کے نیل میں فلاں فلاں عناصر ہیں۔ یا یہ کہ کونکے اور ہیرے کے اجزا بالکل متحد ہیں۔ مگر ہندوستان اور انگلستان کا کوئی ماہر فن جرمنی کا سائیل نہ بنا سکا۔ اور نہ آج تک کسی سائیس واں نے کونکے سے ہیرا بنا کر دکھایا۔ پھر ایسی واقفیت اور ایسا علم آخر کس کام کا؟

پھر عقل انسانی کے فیصلے کس قدر تغیر پذیر ہیں۔ کبھی بڑے بڑے حکمانے یہ فیصلہ کیا تھا کہ دنیا میں چار عناصر ہیں۔ زمین ساکن ہے اور عالم کا مرکز ہے۔ چاند سورج اور افلاک زمین کے گرد گردش کرتے ہیں۔ سیاروں میں روح کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا جو ان کی حرکت کا سبب قرار دیا جاتا تھا۔ مدت ہائے دراز کے بعد اب وہی عناصر مرکب ثابت ہوئے۔ بجائے زمین کے سورج مرکز بن گیا۔ اور زمین متحرک ہو گئی۔ زمانہ سابق میں عقل کے نتائج پر اتنا ہی پختہ اعتماد تھا جتنا آج کل کی تحقیقات عقلی پر ہے۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جب عقل انسانی مادیات کے تعلقات کا پتہ لگانے میں عاجز ہوتی ہے تو پھر انسان ووراز کا رقیاسات کا سہارا ڈھونڈتا ہے اور خود ساختہ مفروضات پر قناعت کر لیتا ہے۔ مگر اپنی عقل کے

عجز کے اعتراف کو اپنی کسر نشان سمجھتا ہے۔ مثلاً اجرام سماوی سے روشنی اور حرارت زمین تک پہنچنے کے لیے فضا میں ایک بے دیکھی اور بے سمجھی ایتھر کے وجود کا نظریہ۔ جس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ اور جس کا کسی نے مشاہدہ اور تجربہ نہیں کیا اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بغیر ایتھر کے روشنی کیوں نہیں پھیل سکتی اور ایتھر کے وجود سے پھیلنے میں کیوں مدد مل جاتی ہے۔ اس قسم کی مثال کا ذکر کرنے سے ہمارا صرف یہ مطلب ہے کہ انسان کو ایسے موقعے بھی پیش آتے ہیں کہ اس کی عقل کام نہیں دیتی تو قیاس کے گھوڑے دوڑانے لگتا ہے۔ حالانکہ جس طرح جو اس کی نارسائی کے وقت عقل سے مدد ملی جاتی ہے اسی طرح عقل کی پرواز ختم ہونے پر اس سے اعلیٰ رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ رہنما وحی ہے۔

اگر کسی امر کا وقوع مشاہدہ یا قابل اطمینان شہادت سے متیقن ہو جائے تو ہم کو لا محالہ امر مذکور تسلیم کرنا پڑتا ہے گو وہ بظاہر عقل اور ایک مسلمہ اصول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ انگلستان کے مشہور مصنف مسٹر ایڈورڈ ہاٹسنگ کا بھرتوں کے عقیدے کے متعلق یہ قول ہے کہ اگر میرا دوست ایک ایسا شخص ہے جو سبباً ہے ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ سنجیدہ شخص ہے۔ عقلمند ہے اور میں اس کی ننانوے باتیں معتبر سمجھتا ہوں اگر وہ دوست بھوت کے وجود کے متعلق اپنی چشم دید کوئی واردات بیان کرے تو آخر کیا وجہ ہے کہ اس کی صرف ایک اس بات کا میں یقین

نہ کروں۔ اور اس کے صرف اس بات کو جھوٹ سمجھ لوں۔  
 سائنس میں بھی بعض امور ایسے پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کے وقوع کا ثبوت  
 نہ ہوتا تو قانون قدرت کو اٹل اور ناتغیر پذیر ماننے والے لوگ عقل کی رو  
 سے ان کے خلاف حکم لگاتے۔ مثلاً قدرت کا قانون ہے کہ سر وی سے جسم سکڑتا  
 ہے اور گرمی سے پھیلتا ہے۔ اس قانون کے مطابق ہم اس نتیجے پر پہنچتے کہ برف  
 پانی سے بھاری ہوگا۔ اور پانی کی نسبت کم جگہ گھیرے گا۔ مگر عقل اور قانون  
 قدرت کے خلاف صرف مشاہدہ نے ہمیں ایک غیر متوقع صداقت کو تسلیم  
 کرنے پر مجبور کیا۔

اسی طرح وحی کا وجود تسلیم کرنے والی اتنی بڑی بڑی تاریخی ہستیاں ہیں  
 جن کی شہادت قبول نہ کرنا حق و صداقت کے انکار کے مترادف ہے۔ حضرت  
 ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ اور رسول خداؐ کوئی معمولی ہستیاں نہ  
 تھیں خصوصاً رسول خدا اور ان کے اصحاب کے حالات تو نہایت تفصیل اور  
 شرح و بسط کے ساتھ ان کے معاصرین کے قلب بند کیے ہوئے ہم تک پہنچے ہیں  
 ایسی جیتی جاگتی چشم دید شہادتوں سے بہتر کسی وقوعہ کی اور کیا شہادت ہو سکتی  
 ہے۔ اگر اسلام کی ابتدائی حالت میں آنحضرتؐ پر وحی کے نزول اور وحی کے  
 ذریعہ معلوم کی ہوئی خبروں اور پیشین گوئیوں پر مسلمانوں کو از روئے مشاہدہ  
 یقین کامل نہ ہوتا تو تیرہ۔ چودہ برس تک شدید مصائب کے حالات میں اسلام پر

اُن کا قایم رہنا سراسر دشوار تھا۔ اگر ایسی چشمہ بدستہا و توں کا اعتبار ساقط ہو جائے تو پھر دنیا میں مقدمات کا صحیح فیصلہ کرنا بہت ہی دشوار ہو جائے مسلمان خدا کی ذات و صفات پر ایمان رکھتے ہیں۔ لہذا اُن کے لیے جی جیسے امر واقعہ کے عقیدہ میں کسی قسم کا تکلف یا گمراہی نہیں ہے۔

”مذہب“

مسٹر جان اسٹوارٹ مل میدان آزاد خیالی کے شہسوار ہیں اور مذہب کے داخل فطرت ہونے سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں اور جن کی درسی کتاب ”لبرٹی“ بہت سے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دلوں میں جوش حریت اور آزادی کی دھن پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے وہ اپنی دو ایسے، Essay (مضمون) مطبوعہ ۱۸۶۴ء کے صفحہ ۱۰۴ پر فرماتے ہیں کہ

جب تک انسانی زندگی انسانی تئناؤں کو بر لانے کے ناقابل ہو تب تک یہاں کی کامیابیوں سے بالاتر لڈاؤ کا اشتیاق قایم رہے گا اور تب تک اس اشتیاق کو صحیح تسکین مذہب سے حاصل ہوگی جب تک دنیاوی ریاست تکالیف سے معمور ہو تسلی کی ضرورت رہے گی جو خود غرضوں کو بہشت کی امید سے اور پارسا لوگوں کو خدا کی محبت سے حاصل ہوگی۔

نام نہاد لا مذہب لوگ مذہب پر غور کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ



مذہب یا خدا کا یقین انسانی فطرت میں داخل نہیں ہے لیکن نوع انسان کو پابند  
 مذہب دیکھ کر اس کی وجہ تلاش کرتے ہیں اور جس طرح عیسائی پادری صاحبان سلام  
 کی ناقابل انکار کامیابی کو اس کے اصلی سبب سے جدا کر کے اس کا ایک فرضی اور خود  
 تصنیف سبب "زور تمشیر" قرار دے کر اسے غیر الہامی ثابت کرتے ہیں ایسی طرح  
 عقلی مسلک کے پیرو مذہب پیدا کرنے والے وجود تلاش کر کے محض اس بنا پر کہ  
 ان کو وہ وجوہ معلوم ہو گئے ہیں مذہب کو غیر فطری قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے  
 کہ جو امور ایجاد مذہب کے اسباب قرار دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً عجائبات عالم  
 یا تکلیف اور راحت خوف اور امید دلوں میں پیدا کرنے والے خارجی اسباب  
 سب فطری ہیں۔ اور ان اسباب سے انسان کا متاثر ہونا بجائے خود تقاضا کے  
 فطرت ہے۔ چنانچہ انسان کا اپنی تمناؤں کو بر لانے کے ناقابل ہونا۔ یہاں کی  
 کامیابیوں سے بالاتر لذائذ کا اشتیاق قائم رہنا۔ اور انسانی زندگی کا تکلیف  
 سے خالی نہ رہنا یہ تمام اسباب بھی فطری ہیں۔ انسان کے خود اپنے پیدا کیے ہوئے  
 نہیں ہیں۔ لہذا جو نتیجہ ان فطری اسباب پر مترتب ہوتا ہے۔ یعنی مذہب  
 وہ بھی فطری ہونا چاہیے۔

بھوک اور پیاس انسان و حیوان کے سب سے مقدم فطری خواہشات  
 ہیں اگر کوئی یہ کہے کہ ہم نے بھوک اور پیاس کے وجوہ کا پتہ لگا لیا ہے یہ  
 خواہشیں معمولی اسباب پر منحصر ہیں۔ ان میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے تو

اس قول سے بھوک اور پیاس کا غیر فطری خواہش ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی ہم کو یوں سمجھانے لگے کہ کھانا اور پانی معدہ میں پہنچ کر معدہ کی حرارت سے تحلیل ہو جاتا ہے۔ اور تحلیل ہونے کے بعد خارج کے ذریعہ جسم انسانی سے باہر نکل جاتا ہے۔ خالی معدہ خشک رہ جانے اور سکڑنے سے ایک طرح کی تکلیف اور اضطراب کو انسان و حیوان محسوس کرتے ہیں اور اسی بے چینی اور اضطراب کا نام بھوک اور پیاس ہے اور کچھ نہیں بھوک اور پیاس کی اس تشریح سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ خواہشیں غیر فطری ہیں۔ اسی طرح مذہب پیدا کرنے کے اسباب دنیاوی تکالیف اور راحت وغیرہ سمجھ میں آجانے سے مذہب کو غیر فطری جذبہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

جب مذہب کی پیدائش کے اسباب فطری اور انسانی قابو سے بالاتر ہیں تو ان اسباب کے نتائج کے فطری ہونے سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے مذہب کے وجود سے انسان کے خیالات اور اعمال پر بندشیں عائد ہوتی ہیں اور فطرت انسانی سہولت پسند ہے۔ اور بندشوں سے رہائی پانے کی قوی خواہش انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے چاہیے تھا کہ مذہب کے خیال کو زائل کرنے کی کوشش آسانی سے کامیاب ہوتی۔ مگر زمانہ چکر کھاتا ہوا چلا جا رہا ہے اور مادی علوم و فنون ترقی کرتے جا رہے ہیں اور عقلی مسلک کے پیرو زبان و قلم سے مدد دراز سے ایڑی

چوٹی کا زور لگا رہے ہیں لیکن پھر بھی اس خوش گوار اور دلفریب آزادی کو پسند کرنے والوں اور ان کے نئے معتقدین کی تعداد کو ان لوگوں کی تعداد سے مقابلہ کیا جاوے جو باوجود آزادی کی فطری خواہش اور پرستار ان آزادی کی پیہم کوششوں کے مذہبی دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالتے تو اول الذکر وہ کی تعداد الشاذ کا معدوم کا مصداق ثابت ہوگی۔ اس واقعہ سے عاجز ہو کر ان آزادی پرست بزرگوں کو اپنے خلاف اہل مذہب کی بے انتہا کثرت دیکھ کر اس کی وجہ تلاش کرتے ہوئے بے اختیار وہی کہنا پڑتا ہے جو سر جان اسٹیوارٹ مل کو کہنا پڑا کہ

جب تک انسانی زندگی انسانی تمناؤں کو بر لانے کی ناقابل  
ہو تب تک یہاں کی کامیابیوں سے بالاتر لہذا اذکا اشتیاق قائم  
رہے گا اور تب تک اس اشتیاق کو صریح تسکین مذہب سے  
حاصل ہوگی جب تک دنیاوی زسیت تجالیف سے معمور  
ہو۔ تسلی کی ضرورت رہے گی۔ جو خود غرضوں کو بہشت کی امید  
سے اور پار سالوگوں کو خدا کی محبت سے حاصل ہوگی۔“

مسٹر برٹن اور ان کے معتقدین نے عجائبات عالم کو مذہب کا محرک  
ماننے کے بعد پیشو ایمان مذہب اور اراکین سلطنت کی تعلیم و ترغیب کو  
بھی قیام و اشاعت مذہب کا سبب گردانا ہوتا کہ ان کے ذریعہ سے

لوگوں کو اپنی اطاعت میں رکھیں اور ان سے ذاتی مفاد حاصل کریں۔ مگر پیشوا یگانہ مذہب کے بنائے ہوئے دپوتا اور ان کی تعلیم کردہ تمدنی معاشرتی اور مذہبی رسوم اور پابندیاں جن پر کبھی سختی سے عمل تھا تہذیبِ تعلیم کی بدولت ایک ایک کر کے نابود ہو گئیں اور ہوتی جا رہی ہیں اور ان پیشوا یگانہ مذہب اور اراکین سلطنت کا اثر مانع نہ ہو سکا۔ بلکہ تہذیب کی ترقی نے خود ان بزرگوں اور ان سے بڑھ کر خود سر بادشاہوں تک کی برتری اور خود مختاری کی وقعت کو دلوں سے مٹا دیا۔ مگر مذہب نہ صرف نابود ہونے سے محفوظ رہا بلکہ اور روشن تر ہو گیا۔

### مذہب و اخلاق

انسان کی فطرت ایسی خود غرض واقع ہوئی ہے کہ اپنے فائدہ سے صرف اُس صورت میں دست بردار ہوتا ہے جب اُس سے بہتر کسی اور فائدہ کی توقع ہو یا کسی بڑے نقصان کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح کاشتکار اور تاجر کو اگر اپنا ذاتی نفع پیش نظر نہ ہوتا تو صرف دوسروں کے نفع کی خاطر وہ ہر گرجمنٹ کی تکلیف برداشت نہ کرتے۔ طالب علم آئندہ نفع کی امید میں برسوں جان سوز محنت کرتا ہے۔ انسان جانوروں کو اپنی غذا بناتا ہے اور اس طرح بے شمار مخلوق کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر چونکہ اپنا کوئی اور بڑا فائدہ ہاتھ سے نہیں جاتا یا کوئی بڑا نقصان فائدہ نہیں ہوتا اس لیے اوروں کے

نقصان کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ بلکہ خود اپنی قوم کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ عام ضرورت کی چیزیں ہنگے داموں خرید کر اپنے صرف میں لاتا ہے اور غریبوں کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ نہ اون کی کوئی رعایت کرتا ہے۔ جبکہ دنیاوی امور میں صورت حال یہ ہے تو ایک لمحہ کے لیے مذہب کو مٹانے کی کوشش کو بار آورمان لیجئے۔ اور خدا کا وجود اور اس کی سزا و جزا کی طاقتوں کو معدوم فرض کر لیجئے۔ اُس وقت جو لوگ دوسروں کا مال چھیننے اور اُن کی جان و آبرو لینے میں اپنا فائدہ تصور کرتے ہوں اور دنیاوی حکومت کے دائرہ اثر سے باہر ہوں یا خود برسر حکومت ہوں یا محض ایشہ دوانیوں سے کامیاب ہو سکتے ہوں وہ اپنی انسانی مگر مریض فطرت کے ہاتھوں کیا کچھ طوفان برپا نہ کریں گے۔ اور دنیا کے سر پر کیا کیا بلائیں نہ لائیں گے۔ اُس وقت کونسی طاقت ہوگی جو اُن لوگوں کو حسن اخلاق پر مجبور کرے گی۔ اور دنیا میں ان کا ایم رکھے گی۔

کہا جاتا ہے کہ آج کل مہذب ممالک میں بہت سے لوگ مذہب چھوڑ چکے ہیں اور باوجود اس کے وہ حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہیں لہذا معاشرت کو ترک مذہب سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ مگر اول تو دیگر کمزور سیاہ فام اقوام کے ساتھ اُن کا برتاؤ بہت کچھ اُن کے اخلاقی حسن و خوبی پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور ثابت کرتا ہے کہ اُن کا نیک برتاؤ محض انھیں کے ساتھ ہی جو برابر کے طاقتور

اور کلمہ بکلمہ جواب دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔ دوسری پتہ کی بات یہ ہے کہ مذہب کا ہزار ہا سال کا طولانی اثر چند صدیوں میں زائل نہیں ہو سکتا چاہے کہ چند نسلوں کی مادی تعلیم اس اثر کو بالکل فنا کر دے۔ مذہب کی بدولت یہ خیال اب تک تمام دنیا کی فضا میں پھیلا ہوا ہے کہ بُرائی کا اثر روح کو تاریک کرنے والا اور اُبّ رائندہ ہزار ہا جسمانی اور روحانی نقصان پہنچانے والا ہے۔ اور کوئی ایسا قانون کا بنانے والا ہے جو عالم کے ذرہ ذرہ پر حکومت کرتا ہے اور اس کی نظر کبھی اور کسی وقت خطا نہیں کرتی اسی خیال کی کشش ہے جو تہک عقلا اور جہلا کے دلوں کو پورے طور پر جستی فائدہ کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ پس مذہب کے بغیر اخلاقی ترقی کی نظیر اسی وقت پیش ہو سکے گی جب یہ مادی تعلیم اور خدا کا انکار بھی مذہب کی عمر کے برابر طول کھینچے۔ اور تمام زن و مرد کے قلوب پر مذہب کی طرح دہریت قابض ہو جائے۔ اس وقت کے لوگ البتہ اخلاق کا نمونہ بن سکیں گے۔

مہاتما گاندھی جی اور پنڈت مالویہ جی اور ان کے ہم خیال لیڈر چھوت اچھوت اور ذات پات کی قیود توڑنے اور مٹانے کی کوشش میں مدت نامے دراز سے ایڑھی سے چوٹی تک کار زور لگا رہے ہیں۔ اور یہ کوششیں کچھ اسی صدی میں شروع نہیں ہوئیں بلکہ روشن خیال ہندو بہت پہلے سے ان اصلاحی کوششوں میں سرگرم رہتے چلے آئے ہیں۔ مگر اس مجوزہ

اصلاح کا خود مصلحین کے قلوب پر جتنا اثر ہوگا اس کی گہرائی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پنڈت مالویہ جی نے چونکہ سمندر پار انگلستان کا سفر کیا تھا تو وہ اسی پر خطا شونی کی عرض سے آپ کو پراسٹنٹ (یعنی مردودہ کفارہ ادا) کرنا پڑا۔ آپ اب بھی سچ قوم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے معاشرتی رسوم کے اعتبار سے ذات پات کے قیود قریب قریب اسی منزل میں ہیں جس میں پہلے تھے۔ اور ان قیود کی شکست کے جو خال خال نظیریں ہیں وہ انشاؤ کا معدوم کے مصداق ہیں۔ خلاصہ یہ کہ صدیوں کے دلنشین عقاید صدیوں ہی میں مٹ سکتے ہیں۔

اگر خدا نخواستہ حقیقت میں ایسا زمانہ آئے کہ تمام عالم خدا کا منکر ہو تو وہ وقت نہایت منحوس ہوگا۔ اور یہ انسانی مخلوق اس وقت بھی انسان ہی رہی اور فرشتہ نہ بن گئی تو نہ ملکی حکومت اور قانون کی پیش جائے گی۔ اور نہ اس کھوکھلی اخلاقی تعلیم کے بنائے کچھ بنے گا جو لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہوں گے وہ وہ قیامت برپا کریں گے کہ عالم تہہ و بالا ہو جائے گا عصمت عفت اور پاکہ منی بے معنی الفاظ رہ جائیں گے۔ مرد کو بیوی اور بیٹی میں تمیز کرنے کی پابندی باقی رہے گی

۱۵۔ ازدواجی تعلقات کی پابندیاں مذہب کی مقرر کی ہوئی ہیں کسی فطرت کے تقاضہ پر نہیں۔ نہ فطرت میں اسی پابندیوں کا وجود پایا جاتا ہے۔ ایک شخص اپنے باغ کے درخت میں قلم لگاتا ہے وہ درخت شیریں پھل لاتا ہے۔ مالک کو اپنے درخت کا پھل کھانے سے عقل مانع نہیں ہوتی

مگر یقین ہو کہ ایسا دن کبھی نہ آئے گا اور جب تک مذہب انسانی فطرت کا جزو  
ہو ان مشتے چند مادہ پرستوں کی کوشش مذہب کو نابود کرنے میں کامیاب نہ ہوگی  
کیونکہ فطرت کو بدلنا انسانی طاقت کے دائرہ سے باہر ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ  
رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

(ترجمہ۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو راہ راست پر لائے پیچھے ہمارے دلوں کو  
ڈالناں ڈول نہ کر اور اپنی سرکار سے ہم کو رحمت کا خلعت عطا فرما کچھ شک  
ہیں تو بڑا دینے والا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶)

پھر بیٹی سے متمتع ہونے میں عقل کس دلیل سے باپ کو مانع آسکے گی۔ ماؤں بہنوں  
بیمٹیوں سے ازدواجی تعلقات پیدا کرنے کے خلاف مذہب ہی تو پابندیاں عائد  
کرتا ہے۔ جب مذہب ہی نہ رہے گا تو پھر یہ پابندیاں بھی نہ رہیں گی۔ (مولف)



# اکھواں باب

## عرض مدعا

جو مسلمان نوجوان اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں یا اپنی تعلیم حال میں ختم کر چکے ہیں اور ہنوز مطالعہ کے عادی ہیں ان کی خدمت میں التماس ہے کہ اس کتاب کو اول سے آخر تک پڑھ جائیے۔ اس میں آپ کسی ایسے مسئلے یا اصول یا نظریہ کا ذکر نہ پائیں گے جو بطور رائے یا قیاس یا عقیدہ کے بلا دلیل زبردستی تسلیم کرنا یا ماننا پڑے بلکہ صرف ایسے مسئلہ اور مستند تاریخی واقعات مذکور ہیں جن سے کسی کو انکار نہیں اور جن کی آج تک کسی نے تردید نہیں کی آپ نے رسول اللہ صلعم کے مختصر حالات ملاحظہ کیے۔ چالیس برس کی عمر تک دوست دشمن آپ کو بالاتفاق سچا اور راست باز تسلیم کرتے ہیں اور آپ کی دیانت اور امانت کے اعتراف کے طور پر آپ کی قوم بالاتفاق آپ کو الَامْبِیْن کا خطاب دیتی ہے۔ چالیس برس کی عمر میں نزول وحی کے بعد آپ اسلام کی تبلیغ شروع کرتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کی بیوی۔ اور آپ کے عزیز واقارب اور آپ کے احباب آپ کی رسالت کی تصدیق کرتے ہیں اور آپ کا دین قبول کرتے ہیں اور آپ کے یہ دوست احباب کوئی مہولی

طبقہ کے لوگ نہیں ہیں بلکہ اس دل و دماغ کے لوگ ہیں جنہوں نے آگے چل کر اپنے اپنے وقت میں بڑے بڑے ملک فتح کیے۔ دو دروازوں کا نہایت عمدہ انتظام کیا۔ سپہ سالار باریاں کہیں! اور ایسی حکومت کی۔ ایسا عدل و انصاف کیا جس کو دنیا کی غیر قومیں آج بھی حیرت انگیز اور بہترین نمونہ قرار دیتی ہیں ان واقعات پر غور کر کے انصاف سے فیصلہ کیجئے کہ کیا ریا کاری۔ مکر و فریب۔ شعبہ بازی اور عیاری کو ایسی مستقل اور ویر پاکامیابی اور سرسبزی نصیب ہو سکتی ہے؟

اس سچے متدین راست باز اور سب سے زیادہ کامیاب رسول کی معرفت دنیا کی اصلاح اور ہدایت کے لیے جو پیغام الہی پہنچا اس کی خصوصیات آپ نے ملاحظہ کیں۔ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اس کلام کی فصاحت و رغبت کے سامنے عرب کے تمام نامور فصحا اور بلغانے سر جھکا دیا۔ کسی کی ہمت نہ بڑھی کہ ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی مانند بھی اپنا کوئی کلام پیش کر سکیں۔ اس کلام کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے تیز و تند مزاج عرب رسول خدا کے دشمن آپ کو قتل کرنے کی غرض سے شمشیر بکھن گھر سے نکلے ہیں مگر اپنی بہن کے گھر پہنچ کر شدت غیظ و غضب کی حالت میں اس کلام الہی کی چند آیات پڑھ کر ان کا پتھر جیسا قلب موم کی طرح پھل جانا ہوا اور آپؐ حضرت کو قتل کرنے کے ارادہ کے بجائے جاں نثاری کے لیے خدمت اقدس میں حاضر

ہوتے ہیں۔ اور کیا بلحاظ فتوحات ملکی۔ کیا بلحاظ عدل و انتظام اور کیا بلحاظ ذاتی اخلاق و عادات کے دنیا میں غیر فانی شہرت حاصل کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مشہور اور سچا تاریخی واقعہ ہے جس کو ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے۔ اور دوست دشمن سب کو یہ واقعہ تسلیم ہے۔

قرآن مجید کی پیشین گوئیوں پر آپ نے غور کیا۔ ابھی مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی اور ظاہری حالات کے لحاظ سے کسی کو ان چند نفوس کے غلبہ کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اور دوسری طرف اپنی کثرت اور قوت کے بھروسہ پر کفار کو یہ یقین تھا کہ ہم ان کٹھنی بھر مسلمانوں کا بہت جلد خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ تیرہ چودہ برس تک کفار مسلمانوں کی مختصر جماعت کو ستائے اور تکلیفیں دیتے رہے۔ مسلمان یہ سب ایذا میں اور مصائب بجا آ رہی اور بے حرمتی برداشت کرتے رہے۔ ان کی تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی معرفت بار بار یہ اعلان کیا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ خود مسلمان غالب ہوں گے اور تمام عرب قبائل کی مخالفانہ قوتوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ چنانچہ آنحضرت کے قلیل زمانہ قیام مدینہ میں قرآن مجید کی یہ سب پیشین گوئیاں پوری ہو گئیں اور آپ کی زندگی میں سارے عرب نے اسلام قبول کر لیا۔ کیا دنیا کی تاریخ میں کسی مظلوم اور ستم رسیدہ مختصر گروہ کی آئندہ شاندار کامیابیوں اور انتہائی عروج کی ایسی پیشین گوئیوں کی کوئی اور نظیر موجود ہے؟

کلام الہی کی تعلیم و ہدایت کا نتیجہ دُنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔  
 قرآنی تعلیم کے بے مثل ہونیکا سب سے زیادہ واضح معیار یہ ہے کہ جو کام  
 اس کتاب نے کر کے دکھایا وہ آج تک کسی دوسری کتاب نے نہیں دکھایا  
 اور قرآن کریم نے جو انقلاب دُنیا میں پیدا کیا اور جس طرح نہایت سستی کی حالت  
 سے ایک قوم کو اٹھا کر چند سال کے اندر اوج کمال تک پہنچایا اُس سے متعلق  
 ساری دُنیا کو اعتراف ہے کہ ایسا عظیم الشان انقلاب کسی اور کتاب نے پیدا کر کے  
 نہیں دکھایا۔ چنانچہ مسٹر سیریل قرآن مجید کے اپنے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ میں  
 شہادت دیتے ہیں کہ

دُنیا میں اس دین کو جو قبولیت حاصل ہوئی اُس کی کوئی مثال  
 اور نظیر نہیں ہے۔ اور اس دین کو نہ صرف اُن قوموں نے قبول کیا  
 جن پر مسلمانوں نے کبھی فوج کشی نہ کی تھی بلکہ اُن لوگوں (یعنی ترکوں  
 اور تاتاریوں) نے بھی قبول کر لیا جنہوں نے اہل عرب کو اُن کی  
 فتوحات سے محروم اور اُن کی سلطنت بلکہ اُن کے خلیفوں کا خاتمہ  
 کر دیا اور جس میں کوئی بات اُس سے بڑھ کر تھی جو ایک مذہب میں  
 عموماً خیال کی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے اُس نے ایسی عجیب ترقی  
 کی

پیش اور یہ عالمگیر تاثیر جس نے فاتحین کو مفتوح اور مغلوب کیا اگر حق و

صداقت کا نتیجہ نہ تھی تو آخر اس دین کی اشاعت کا اور کیا سبب قرار دیا  
جاسکتا ہے۔

ڈیوٹی نے جو اٹلی کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ مشہور شاعر اور ایک لکشن  
اور لطیف نظم لکھی ہے جس کے دو مصرعوں کا مضمون یہ ہے کہ موسم زمستان میں جبکہ  
زہریلی گرفت سے کوئی چیز آزاد نہ تھی میں مدتوں ایک سوکھی سی شاخ پر ایک  
کانٹے کو دیکھتا رہا لیکن جب جاڑے گئے اور موسم بہار آیا تو اس کانٹے  
کے سرے پر ایک خوش رنگ پھول نکل آیا جس کی خوشبو نے میرے دل و  
دماغ کو معطر کر دیا،

حضرت رسول خدا کے ظہور نے اس دلائل و پرتشبیہ کو مجاز سے حقیقت میں  
بدل دیا۔ یہ عہد سے پیشتر دنیا خا زار بنی ہوئی تھی مگر اس کبھی نہ فراموش  
ہونے والی تاریخ کے بعد جبکہ حضور رحمتہ للعالمین کا ظہور ہوا تو وہ ایک بیک لالہ زار  
ہو گئی۔

ان سب واقعات کا علم ہو جانے کے بعد اگر آپ کا دل گواہی دیتا ہے۔ اور کوئی توجہ  
نہیں کہ قلب ایسی گواہی نہ دے کہ قرآن مجید پیغام الہی ہے تو اس پیغام کے ایک  
ایک لفظ اور ایک ایک حرف سے واقف ہونا ہر اس شخص کا پہلا فرض ہے جو  
اپنے آپ کو مسلمان کہے۔

عالم تنہائی میں جب کہ چاروں طرف سکوت کا عالم ہو اور آپ کی توجہ کو

منتشر کرنے والے اسباب مفقود ہوں اُس وقت تھوڑی دیر کے لئے قرآن مجید کو غور سے مطالعہ کیجئے۔ اُس کے مطالب پر آگاہ ہو جیئے۔ آپ کو اس مطالعہ میں غیر معمولی لذت محسوس ہوگی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ صداقت افسانہ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ ساتھ ہی آپ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اور پیش آمدہ مشکلات میں اس کلام الہی کو اپنا سب سے زیادہ شفیق اور مخلص رہنما پائیں گے۔

میرے ایک ملنے والے انگریزی زبان سے بالکل ناواقف تھے کمشنر نے اُن کو سائرفیکٹ دیا جس میں ایک جملہ یہ بھی تھا "ہی ہیزڈن گڈ وار ورک" He has done good war work یعنی اس شخص نے یورپ کی جنگ عظیم کے سلسلہ میں اچھا کام کیا ہے" ان صاحب کو انگریزی الفاظ کے اُردو ترجمہ سے کچھ لطف نہ آتا تھا لہذا اُنھوں نے اصل انگریزی الفاظ حفظاً کر لیے تھے اور اُن کو جھوم جھوم کر اپنے اجاب کے سامنے دہرایا کرتے تھے۔ اسی طرح دہلی کے ایک صاحب کو وہاں کے چیف کمشنر نے سندوی تھی جس میں لکھا تھا "ہی از دی موسٹ لائل سٹیزن آف دہلی" He is

یعنی the most loyal citizen of Delhi  
یہ شخص دہلی کا سب سے زیادہ وفادار باشندہ ہے، یہ صاحب بھی انگریزی سے نا آشنا تھے مگر یہ جملہ جو اُنھوں نے حفظ کر لیا تھا اپنے اجاب کے سامنے لطف

لے لیکر بیان فرمایا کرتے تھے۔

بغیر سمجھنے کے شاہی زبان کے قلب پر خاص اثر ڈالنے کی یہ چشم دید مفید  
مطلب مثالیں ہیں۔ جب شاہی زبان میں یہ دلکشی اور دل فریبی ہو تو  
بشرطیکہ دل کو کھوڑا سا لگاؤ ہو کلام الہی کی تاثیر میں کیا کلام ہو سکتا  
ہو۔ کلام مجید کی عبارت فصیح بھی ہو اور بلیغ بھی۔ فصاحت سے مراد کلام کا ایسے  
الفاظ سے ترکیب پانا مراد ہو جو زبان پر تلفظ کے وقت سہل ہوں اور کانوں  
کو خوش گوار ہوں۔ اور دل میں فوراً اثر پیدا کریں۔ بلاغت سے مطلب ہے  
کھوڑے سے کھوڑے الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطلب ادا ہونا جب  
کلام حد سے زیادہ بلیغ ہو گا اور حشو و زوائد سے بالکل پاک ہو گا تو جملوں  
کے باہم ربط کو سمجھنے کے لئے فہم رسا اور نظر دقیق کی ضرورت ہوگی۔ جو  
لوگ بلیغ کلام کے سمجھنے کے خواہر ہوتے ہیں وہ کلام کی خوبیوں کو بہ آسانی  
سمجھ لیتے ہیں اور اس کا لطف اٹھاتے ہیں۔ مثلاً غالب کے اشعار بادیاؤں  
عاقظ کی غزل یا مثنوی مولانا روم کا کوئی ٹکڑہ یا سہ نثر ظہوری کی عبارت  
سن کر اہل ذوق فوراً لطف اندوز ہوتے ہیں مگر عوام کے لئے ان کتابوں  
کی متعدد شرحیں شایع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ یہی کیفیت قرآن مجید  
کی عبارت کی ہے۔ اپنی بد مزائی کی وجہ سے بعض نکتہ چینوں کا خیال ہے کہ  
کلام الہی کے مضامین اور عبارت میں کوئی ترتیب اور ربط نہیں ہے۔ خیال

ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ساری دنیا میں ابنا سے لیکر آج تک ایک ہی ترتیب  
 کا رواج اس کا شاہد ہے کہ سورتوں اور آیتوں کی موجودہ ترتیب سراسر  
 آنحضرت کی ہدایت کے مطابق ہے۔ چونکہ آنحضرتؐ کی وفات کے وقت  
 بہت سے حفاظ موجود تھے جن کو یقیناً تمام قرآن مجید بالترتیب یاد تھا  
 اور جس کی وہ نماز میں اور نماز کے علاوہ ترتیب مقررہ کے ساتھ تلاوت فرماتے  
 تھے اور جن کی مدد سے حضرت ابو بکرؓ نے اسی ترتیب سے پہلی بار اس کو  
 لکھوایا اور جس کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اس کی نقلیں ممالک مفتوحہ  
 میں تقسیم کرائیں اور جو ترتیب ملا اختلاف تمام دنیا اسلام میں مستند  
 سمجھی جاتی ہے اس ترتیب کے صحیح ہونے میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔  
 آیات و سورتوں کے نزول کی ترتیب دو سہری ہوتا بالکل غیر متعلق مسئلہ  
 ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہو جیسے ہمارے ملکی قانون کی ہے۔ ملکی قانون  
 میں حسب اقتضا ضرورت جو اضافے (یا ترمیمات) وقتاً فوقتاً ہوتے  
 رہتے ہیں وہ بہ اوقات مختلف گورنمنٹ پر میں چھپ کر کاغذ کے  
 تراشوں کی صورت میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور جن لوگوں کے پاس وہ  
 قانون کی کتاب ہوتی ہے وہ مطبوعہ ہدایات کے مطابق ان اضافوں  
 اور ترمیموں کے مطبوعہ تراشوں کو اپنی اپنی جگہ مناسب قعہ پر اس کتاب میں  
 چسپاں کر لیتے ہیں ان اضافوں اور ترمیموں کی طباعت اور اشاعت کی تاریخ کا اصل



قانون کی کتاب کی ترتیب پر کوئی اثر نہیں پڑتا تمام کلام مجید آنحضرتؐ کے زمانہ میں نازل ہو چکا تھا۔ پھر یہ بات کسی طرح عقل گوارا نہیں کرتی کہ اس قدر طویل مضامین کی کوئی ترتیب آنحضرتؐ نے قائم نہ فرمائی ہو۔ اور آنحضرتؐ صلعم غم اور اس وقت کے تمام حفاظ قرآن مجید کی تلاوت بغیر کسی ترتیب کے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق کیا کرتے ہوں اگر ایسا ہوتا تو قرآن مجید کی پہلی ترتیب کے وقت حفاظ میں نیز دیگر مسلمانوں میں باہم سخت اختلاف ہوتا ہوتا اور جھگڑا ہوتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بعض علمائے تو آیات اور سورتوں کی موجودہ ترتیب کو بھی بجائے خود قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ قرار دی ہے۔ چنانچہ جب آیات کا باہم ربط بتلانے سے معلوم ہو جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایسی آسان بات پہلے بغیر بتلانے سے خود بخود کیوں سمجھ میں نہ آئی۔ مثلاً ایک بزرگ ماہر قرآن کریم کی صحبت میں سورہ وَالْحَدِیٰتِ کا ترجمہ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔

وَالْحَدِیٰتِ ضَبْحًا هَ فَاَلْمُوْرِیٰتِ قَدْ حَا هَ فَاَلْمُغِیْرَاتِ  
ضَبْحًا هَ فَاَنْثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوْسَطُنْ بِهٖ جَمْعًا هَ اِنَّ الْاِنْسَانَ  
لِرَاٰیہٗ لَکَنُوْدٌ ۙ

(ترجمہ) (فاز یوں کے) ان گھوڑوں کی قسم جو دوڑتے دوڑتے ہانپ اٹھتے ہیں پھر (پتھروں پر اپنی ٹاپوں) کے مارنے سے چنگاریاں نکالتے ہیں

پھر صبح کے وقت دشمنوں پر چھا پا جا مارتے ہیں۔ پھر اس وقت اپنی  
دوڑ دھوپ سے) غبار بلند کرتے ہیں۔ پھر اسی وقت (دشمنوں کی) جانت  
میں جا گھستے ہیں۔ بے شک انسان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکر ہے۔  
ہم جس چیز کی قسم کھاتے ہیں اس کو اپنا گواہ قرار دیتے ہیں۔ مثلاً خدا کی قسم  
ایسا ہوا یعنی خدا گواہ ہے ایسا ہوا۔ اسی طرح قرآن شریف میں وارد ہوا ہے  
وَالْحَصْرِ يَا وَالْعَدِ يَتِ یعنی زمانہ کی قسم (زمانہ اس کا شاہد ہے) یا گھوڑے  
کی قسم (گھوڑا اس بات کا گواہ ہے) ملک عرب میں گھوڑے کو جو فضیلت حاصل  
ہے اور عربوں کو اپنے گھوڑوں سے جو غیر معمولی تعلق ہوتا ہے اس اہمیت کے  
حفاظت سے گھوڑے کو گواہ قرار دیا گیا کہ گھوڑوں کی قسم انسان اپنے پروردگار کا  
بڑا ہی ناشکر ہے۔ چونکہ گھوڑے اور انسان کے ناشکرے پن میں بظاہر کوئی تعلق  
معلوم نہیں ہوتا اس لیے دریافت کیا گیا حضرت مولانا صاحب صرف اتنا کہنے  
پائے تھے کہ جن گھوڑوں سے جنگ میں یہ یہ خدمات لی جاتی ہیں یہاں تک  
کہ آخر میں وہ جان دے دیتے ہیں ان کو چند ٹنگے گھاس کے تنکے اور  
گھوڑا سنا چنے کا دانہ آپ دیتے ہیں۔ بس اتنا سن کر سب مطلب سمجھ میں  
آ گیا۔ اور تعجب تھا کہ اتنی موٹی بات خود ہماری سمجھ میں کیوں نہ آئی۔  
خلاصہ یہ ہوا کہ جن گھوڑوں کو آپ چند تنکے گھاس کے اور گھوڑا سنا  
دانہ کھلا کر ان سے ایسی ایسی جانناہ خدمتیں لیتے ہیں۔ تو انسان کو جو نعمتیں

عطا ہوئی ہیں۔ ان کے بدلے آپ اپنے آقا کے کیا کیا خدمات بجالاتے ہیں۔ چونکہ کلام الہی نہایت بلیغ ہے اس لیے عام مسلمانوں کے سمجھنے کے لیے کھوڑی بہت تشریح لازمی ہے۔ خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے اردو ترجمہ کی ضرورت ہے جس میں زمانہ حال کی جدید تحقیقات کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسے فٹ نوٹ ہوں جن میں نہایت تحقیق اور تفتیش کے بعد حیران کنی اور تاریخی حوالوں کی مناسب وضاحت ہو۔ اور مروجہ مختصر تفسیری حاشیوں کے علاوہ سورتوں کے شروع میں ترتیب آیات کا لحاظ رکھتے ہوئے مفسران کا خلاصہ دیج ہو۔ اور سورتوں کا باہم ربط نیز جہاں جہاں ضرورت سمجھی جائے وہاں آیات کا باہم ربط اور تعلق ظاہر کر دیا جائے۔ ضخامت جہاں تک ممکن ہو کم سے کم ہوتی کہ معمولی حیثیت کے مسلمان اس کا ہدیہ ادا کرنے کے متحمل ہو سکیں۔ جمل لغات، فلسفیانہ مباحث، مفسرین کی رائیں اور اعتراضات اٹھا کر ان کے جواب لکھنے کی کوشش۔ نیز ایسی تفصیلات کی ضرورت نہیں جن کا اہل متن سمجھانے سے گہرا تعلق نہ ہو۔ ایسا ترجمہ میسر ہونے سے اسکولوں اور کالجوں کے لیے دینی نصاب کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا بشرطیکہ قرآن مجید پڑھانے والے اتنے تعلیم یافتہ تو ہوں جتنے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ اور اقتصادیات وغیرہ مضامین پڑھانے والے ہوتے ہیں میں نے مولوی محمد علی صاحب ایم۔ اے (لاہور) کا اردو ترجمہ قرآن مجید دیکھا ہے اور

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ترجمہ بیان القرآن بھی مطالعہ کیا ہے ان دونوں ترجموں میں اختصار کی بہت گنجائش ہے۔

ہم سب واقف ہیں کہ مطبوعہ بائبل کے نسخوں میں کوئی تفسیر نہیں ہوتی حالانکہ یورپ میں عیسائی محققین اور علما کی کمی نہیں ہے بلکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کی تحقیقات علمی کا پایہ بھی بلند ہے۔ مگر چونکہ عیسائیوں کو بائبل پڑھانے والے اپنے مضمون کے ماہر ہوتے ہیں اور اپنے مضمون سے شغف بھی رکھتے ہیں اس لیے وہاں تفسیر غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے مفسرین بلحاظ رواج کے یہ جانتے ہیں کہ قرآن مجید کسی درسگاہ میں درساً و رسماً استاد نہیں پڑھاتے۔ بڑے مدرسوں میں تفسیریں اور تفسیروں کی تفسیریں البتہ پڑھائی جاتی ہیں اس لیے ترجموں اور تفسیروں میں طوالت ناگزیر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان جو عموماً معرے قرآن مجید یا مروجہ مترجم نسخے خریدتے ہیں وہ ایک طرف مفصل تفسیروں کے فیض سے محروم رہتے ہیں اور دوسری طرف مروجہ ترجمے تفہیم مضامین میں کافی مدد نہیں دیتے۔ اور جن مفید مطلب تفسیری ترجموں کا مجھے علم ہے ان کا یہ زیادہ ہے۔

قرآن مجید کا ترجمہ غور اور توجہ کے ساتھ مطالعہ کرنے اور سمجھنے سے طلباء پر یہ راز خود منکشف ہونے لگے گا کہ اس کتاب اللہ میں وہ کون کون سی باتیں ہیں جن پر عمل کرنے سے جاہل عربوں نے بہت تھوڑے عرصہ میں دنیا کو

فتح کر لیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ اب کیوں مسلمانوں کو اس کتاب کے مطالعہ سے پہلے کی طرح نفع نہیں ہوتا۔ یہ حجت صحیح نہیں ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ اور پہلے ہتھیار اس زمانہ کے نئے آلات کا مقابلہ نہیں کر سکتے جس وقت عرب میں بدو ساریبانوں کی قوم جاگی ہو تو عرب کی سرحدوں سے ملحق رومہ الکبرے اور فارس کی نہایت شائستہ اور مہذب سلطنتیں قائم تھیں ان شائستہ قوموں کے ذہن میں اہل عرب کی جو وقعت تھی وہ یز و جرد شہنشاہ فارس کے اس قول سے ظاہر ہوتی ہے۔

ز شیر شتر خوردن و سو سمار عرب را بجائے رسیدت کار  
کہ تحت کیاں را کنند آرزو تفویہ بر تو ای چرخ گرداں تفویہ

مگر ابھی جاہل اور اونٹ چرانے والے بدوں نے اسی قرآن مجید کے زیر ہدایت جو کام کیے دنیا ان سے واقف ہے۔ کیا تعجب کی بات نہیں کہ اسی ملک ہندوستان کے رہنے والے اسی زمانہ میں ہماری ہمسایہ قوم (ہندو صاحبان) کے بڑے بڑے سربراہ اور وہ لیڈر گینتا کے ذریعہ سے جو تصوف کا ایک سالہ اور ہا بھارت اور رامائن کے افسانوں کے ذریعہ سے اپنی قوم میں ترقی کی روح پھونکنے کی کوششیں کر رہے ہیں اور ان کے حوالوں سے قومی ترقی کے دلوں کو براہ گینتہ کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں مسلمان اپنے آپ کو مس عجیب و غریب کتاب سے بے نیاز سمجھ بیٹھے ہیں جس کا کچھ حال صفحات

ماہق میں مذکور ہوا ہے۔  
 قرآن مجید اعلان کرتا ہے وَنُنزِلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ  
 لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝

یعنی قرآن کو ہم نے مومنوں کے لیے شفا اور رحمت کر کے بھیجا ہے  
 کیا کوئی مسلمان اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے۔ کیا یہ وعدہ  
 صرف پرانے زمانہ کے مسلمانوں سے مخصوص تھا۔ اور اب یہ آیت معطل ہو گئی  
 ہے۔ ہمارا مرض ہونا مسلم۔ اور قرآن مجید شفا ہونے کا مدعی۔ لہذا یہ مسئلہ حل طلب  
 ہے کہ ایسے مجرب نسخے سے مرض کا ازالہ کیوں نہیں ہوتا۔ اطباء قدیم کی تحقیقات  
 سے اطباء کے حال برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں اور پرانی جرئی بوٹیوں کو نئے طریقوں  
 سے زود اثر بنا کر دنیا کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ نظریہ حالات کیا اس امر  
 کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ قرآن مجید کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور  
 درمقصود کی تلاش میں اس بحر ذخار میں غوطہ لگایا جائے۔

حضرت شاہ اسماعیل صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب **تقیات الایمان**  
 کے صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں کہ

اُس زمانہ میں دین کے معاملہ میں لوگ کتنی رہیں چلتے ہیں کوئی  
 پھلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں۔ کوئی بزرگوں کے قصے دیکھتے ہیں  
 اور کوئی عالموں کی باتوں کو جو آنکھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے

نکالی ہیں سند کپڑتے ہیں۔ اور عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ اللہ رسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے سمجھنے کو برا علم چاہیے ہم کو وہ طاقت کہاں کہ ان کا کلام سمجھیں اور اس راہ پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے۔ سو ہماری کیا طاقت ہے کہ اس کے موافق چلیں تاکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں۔ سو یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس واسطے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف اور صریح ہیں ان کا سمجھنا مشکل نہیں اور اللہ اور رسول کے کلام سمجھنے کو بہت علم نہیں چاہیے کیونکہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے کو اور جاہلوں کو سمجھانے اور بے علموں کو علم سکھانے کو آئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ

سورہ جمہ در کو ع (۱۴) میں ارشاد فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ (یعنی وہ خدا ہی تو ہے جس نے ان پر مھوں میں انھیں میں سے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ وہ ان کو خدا کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے ورنہ اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے)

سو جو کوئی یہ آیت سن کر پھر کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی سمجھ نہیں سکتا اور ان کی راہ پر سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا تو اس نے اس آیت کا انکار کیا۔ اس بات کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک بہت بڑا حکیم ہو اور ایک بہت بیمار۔ پھر کوئی شخص اس بیمار سے کہے کہ فلا نے حکیم کے پاس جا کر اس کا علاج کراؤ اور وہ بیمار کہے کہ اس حکیم سے علاج کرانا تو بڑے بڑے تندرستوں کا کام ہے مجھ سے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کیونکہ میں تو سخت بیمار ہوں۔ سو وہ بیمار نادان ہے اور اس حکیم کی حکمت کا انکار کرتا ہے۔ اس واسطے کہ حکیم تو بیماریوں ہی کے علاج کے واسطے ہے۔ جو تندرستوں کا علاج کرے اور انہیں کو اس کی دوا سے فائدہ ہو اور بیماروں کو کچھ فائدہ نہ ہو تو وہ حکیم ہی کا ہے کا ہے؟

حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل قرآن مجید پر غور و فکر کرنا بہت ضروری اور نفع بخش ہے۔ قرآن مجید کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے لیے ایسا مکمل ہدایت نامہ پیش کرتا ہے جو بیک وقت انسان کی انتہائی روحانی اور مادی ترقی کا ضامن اور کفیل ہے۔ اور جس نے دین و دنیا کو لازم ملزوم قرار دیا۔ اور آنحضرتؐ کے وجود کو اپنی تعلیم کا بہترین نمونہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آدمی خلافت



کے بغیر عبدیت میں کامل نہیں ہو سکتا۔

اسی تعلیم نے وحشی عربوں میں بہت جلد ایسے اوصاف اور اخلاق پیدا کر دیئے کہ ایک طرف تو وہ سب سے زیادہ موحد اور خدا پرست بن گئے اور دوسری طرف چند سال کے عرصہ میں دنیا کی بڑی بڑی زبردست سلطنتوں نے ان کے سامنے سراطاعت خم کر دیا۔

تاریخ عالم شاہد ہے کہ ہر قوم کی اخلاقی اور مادی حالت کی ترقی اور تنزل کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ جیسی قوم کی مادی حالت ہوتی ہے ویسے ہی اس کے اخلاق ہوتے ہیں۔ اگر قوم زندہ ہوتی ہے تو اس کے افراد میں جرات ہمت۔ استقلال۔ ترقی کی اُمتگ۔ قربانی کا دلولہ اور جوصلہ ہوتا ہے۔ اور جب قوم مردہ ہوتی ہے تو اس کے افراد پست ہمت سُست۔ بُزدل۔ ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھنے والے ہوتے ہیں۔ نواب محسن الملک مرحوم نے ایک موقع پر اس تنزل کو ایک مثال سے واضح کیا تھا کہ جب مسلمانوں میں کچھ جان بھتی تو ان میں وعدہ اور قول و قرار کا دوسرا مفہوم تھا۔ اور جب ان پر مردنی چھا گئی تو انھیں الفاظ کا دوسرا مفہوم ہو گیا یعنی پہلے مشہور تھا "قول مرداں جاں دارد" پھر یہ حالت ہو گئی "وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے" اب اس کے بعد رفتہ رفتہ حالت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ "وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا"

اسی طرح قرآن مجید کی اصطلاحوں نے بھی ہماری پستی کے لحاظ سے

نے نئے معنی پہن لئے ہیں مثلاً اسلام کی تعلیم "توکل" کو غیر قوموں نے نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا تھا۔ قرآن مجید کی سورہ مائدہ کے رکوع ۴ میں ارشاد ہوتا ہے: **قَالُوا يَمْوَسِي آلَ إِسْرَائِيلَ إِتَّخَذُوا مِنْهُمْ دِينًا قُلْ مَا جَاءَ بِرَبِّينَ وَلَا نَالِنَا نَدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا تَاَدَّخِلُونَا ۗ قَالِ الرَّجُلِينَ مِنَ الَّذِينَ يُتَخَفُونَ أَلَعَدِ اللَّهُ عَلَيْهِمْ أَدْخَلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاخْرَأُ دَخَلْتُمُوهُ فَآتَانَهُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَتَقَاتِلُوا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** (یعنی وہ لوگ کہنے لگے کہ اگر موسیٰ اس ملک میں تو بڑے زبردست لوگ کہتے ہیں۔ اور جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم تو اس ملک میں قدم رکھتے نہیں۔ ہاں وہ لوگ اس میں سے نکل جائیں تو ہم ضرور جا داخل ہوں گے خدا کا ڈر ماننے والوں میں سے دو آدمی تھے کہ ان پر خدا نے اپنی خاص ہرمانی کی وہ بول اٹھے کہ ان پر چڑھانی کر کے دروازے میں گھس پڑو اور جب تم دروازہ میں گھس پڑے تو بلاشبہ تمہاری فتح ہوگی اور تم ایمان رکھتے ہو تو اللہ پر توکل کرو)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ توکل سے مطلب ہے مشکلات کی حالت میں پوری ہمت سے کام لینا اور نتیجہ کی طرف سے خائف ہو کر کام نہ چھوڑنا بلکہ نتیجہ کے متعلق خدا تعالیٰ سے کامیابی کا بھروسہ رکھنا۔

لیکن اب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جانے اور کچھ کام نہ کرنے کو توکل کہنے لگے

چنانچہ ایسے ایسے قصے مشہور ہیں کہ ایک صاحب نے توکل کیا۔ اور ہاتھ پیر ٹوڑ کر بیٹھ رہے اور عہد کیا کہ میں اس وقت تک کھانا نہ کھاؤں گا جب تک خود بخود کھانا غیب سے میرے منہ میں نہ آجائے گا۔ اسی طرح کچھ عرصے بیٹھے رہے اس کے بعد کھانے کا ایک خوان ان کے سامنے آ موجود ہوا۔ وہ سمجھے کہ کام ہو چکا اور اپنے ہاتھ سے کھانا کھانے لگے۔ اتنے میں غیب سے ندا آئی تو جلدی کر گیا اگر کچھ دیر اور استقلال سے کام لینا تو کھانا خود بخود لقمے بن کر تیرے منہ میں پہنچتا۔ چونکہ قرآن مجید میں توکل کی تعریف ہے اس لیے نیکے لوگ مستحق تعریف قرار پائے کہ فلاں صاحب بڑے متوکل ہیں کچھ کام نہیں کرتے کبھی گھر سے باہر بھی نہیں نکلتے۔

اسی طرح "صبر" کے معنی آج کل فقط یہ لیے جاتے ہیں کہ کوئی مصیبت

آپڑے تو اظہارِ غم نہ کریں۔ وقتیں برداشت کریں اور چپ چاپ بیٹھے رہیں اُت نہ کریں۔ اس قسم کی بے حمیتی کی تعریف کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ یہ قرآنی ہدایت کی تعمیل ہے۔ حالانکہ قرآن مجید میں جس صبر کی تعریف ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحیح اصول پر کام کرنے میں جو وقتیں پیش آئیں ان کا برداشت کرنا اور کام کو جاری رکھنا اور نیا ہنا۔ اور مشکلات سے گھبرا کر اپنا کام نہ

چھوڑنا۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے رکوع ۱۰ میں ارشاد ہوتا ہے

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيِّ قَاتَلَ مَعَهُ رَبِّيُنَ كَثِيرًا فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ

فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ

(یعنی اور بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والے لوگ دشمنوں سے لڑے تو جو مصیبت ان کو اللہ کے راستہ میں پہنچی اس کی وجہ سے نہ تو انہوں نے ہمت ہاری اور نہ ہودا پن کیا اور نہ دشمنوں کے آگے عاجزی کا اظہار کیا اور اللہ صابروں کو دوست رکھتا ہے)

کلام مجید میں صابروں سے توقع کی جاتی ہے کہ کم سے کم اپنے سے دگنی

قوت پر وہ غالب ہو جائیں گے۔

فَإِنْ يَكُ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ وَغَالِبَةٌ وَإِنْ يَكُ مِنْكُمْ  
أَلْفٌ يَغْلِبُ أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ - وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

یعنی اگر تم میں سے سو صابر ہوں گے تو وہ دو سو پر غالب رہیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایسے ایک ہزار ہوں گے تو وہ خدا کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ صابروں کے ساتھ ہے۔ (سورہ انفال رکوع ۹)

ان مثالوں سے صرف یہ جملانا مقصود ہے کہ اصل کتاب پیش نظر نہ رہنے سے اور شرعی تفصیلات کی طرف متوجہ ہو جانے سے ایک تو الہامی الفاظ کے غلط مفہوم رائج ہو گئے۔ اور دوسرے کلام مجید کی تعلیم کے ضروری پہلو نظر انداز ہو گئے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی معاشرتی، اخلاقی، اور سیاسی پستی اب اس

حد تک پہنچ گئی ہو کہ یہ خیال عام ہو گیا ہو کہ روحانی ترقی اور دنیاوی ترقی دو متضاد حقیقتیں ہیں۔ چنانچہ مسلمان عموماً اب دو طبقوں میں تقسیم نظر آتے ہیں ایک بزرگم خود روحانی اور دوسرا دنیاوی۔ پہلے طبقہ نے اپنا فرض گوشہ نشینی اور ترک دنیا اور ماحول سے بے خبر رہنا قرار دیا۔ ان کا خیال ہے کہ دنیاوی عزت ثروت حکومت اور تو نگری غیر مسلموں کے لئے ہے۔ اور محتاجی فقیری اور مسکینی مسلمانوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا مسلمانوں کے لئے نہیں ہو بلکہ کافروں کے لئے مخصوص ہے۔ اور جنت مسلمانوں کے لئے ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید  
نا امید سی اُس کی دیکھا چاہیے  
دنیا بکری ہے اور اُس کے طالب کئے۔

اہل دنیا کا فران مطلق اند۔ روز و شب و رزق و رزق و درلق بن اند اس کے برعکس دنیاوی ترقی کی کوشش کرنے والے بد قسمتی سے اپنے آپ کو روحانی ترقی سے بے نیاز سمجھنے لگے۔ طرفین کے یہ خیالات قرآنی تعلیم کے بالکل برخلاف ہیں۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ اور بار بار دوہرایا گیا ہے کہ جن لوگوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا اور احکام الہی کی پیروی نہیں کی ان کو جہاں دیکھو ذلت ان کے سر پر سوار ہے اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں۔ اور محتاجی ہے کہ الگ ان کے پیچھے پڑ گئی ہے

یعنی محتاجی اور مسکنت خدا کے غضب کی نشانی قرار دی گئی ہے۔ اس کے برعکس جیسا کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں بتلایا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے ان کو دنیا میں غلبہ حکومت اور سلطنت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور یہ کہ عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنین ہی کے لیے ہے۔

اگر غور اور توجہ کے ساتھ قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے تو دنیاوی زندگی کو کامیاب بنانے کے موثر وسائل کی اس میں بہت کچھ تصدیق ہے۔ عام طور پر قرآن مجید میں جو قصے بیان ہوئے ہیں ان کو صرف حکایتوں اور کہانیوں کا درجہ دیا جاتا ہے اور ان سے حقیقی طور پر استفادہ ہونے کا قصد ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ خود قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ قرآنی قصص میں مسلمانوں کے لیے ہدایت اور نصیحت مقصود ہے۔ مثلاً حضرت یوسف کا قصہ عام طور پر حسن و محبت کا ایک واقعہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ قرآن مجید اس کو احسن القصص قرار دیتا ہے۔ اس قصہ میں علاوہ اور بہت سی خوبیوں کے اپنے جذبات پر قابو رکھنے۔ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرنے اور کسی حالت میں اپنے فرض سے غافل نہ ہونے اور اپنے کام کو نہ چھوڑنے اور اسی قسم کی ان مخصوص اخلاق کی تعلیم ہے جن سے ایک شخص غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے حکومت کے مرتبہ پر پہنچ سکتا ہے۔ حضرت یوسف نے اپنے صحیح اصول کے خلاف کام کرنے کی بجائے قید کی مشقت برداشت کی اور جب آپ

قید خانہ میں مجبوس ہو گئے تو وہیں قیدیوں کو توحید کی تبلیغ شروع کر دی۔  
 اسی طرح مثلاً طاہر اور جالوت کا قصہ ہے اس میں اہم کام انجام دینے کی  
 ہدایتیں شامل ہیں۔ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے افسر (لیڈر) کی ضرورت۔ افسر  
 کی صفات کہ علمی اور جسمانی دونوں قوتیں اس میں اعلیٰ درجہ کی ہونا ضروری  
 ہیں اور اس بات کی تلقین کہ مالدار ہونا افسری کی کوئی ضروری شرط نہیں۔  
 سات ہی کام کرنے والوں کی صفات کا ذکر ہے کہ یہ لوگ آزمائش کے بعد منتخب  
 کیے جائیں۔ پیروں میں ڈسپن کی ضرورت اور یہ کہ کامیابی کے لیے کثرت  
 تعداد لازم نہیں ہے۔ اگر تعداد کم ہو لیکن لوگ ثابت قدم اور مشکلات بردار  
 کرنے والے ہوں اور جذبات پر قدرت رکھتے ہوں تو کثیر جماعت پر غالب ہوں گے  
 حضرت موسیٰ کے قصے کو چند معجزات میں محصور سمجھا جاتا ہے۔ اور زیادہ تر  
 بحث اس پر ہوتی ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ نے پھر قلمزم کو عبور کیا تو  
 معجزہ کی وجہ سے پانی پھٹ کر علیحدہ ہو گیا اور خشکی نکل آئی یا معجزہ نہ تھا  
 صرف معمولی جذر و مد تھا۔ ساری توجہ اس قسم کی بحث پر صرف ہو جاتی ہے  
 حالانکہ اس قصہ میں تعلیم ہی اپنی قوم کو انتہائی ذلت اور ظلم سے نکال کر ترقی  
 کے اعلیٰ درجہ پر پہنچانے کی۔ بنی اسرائیل اس قدر ذلیل حالت میں تھے کہ  
 ان کے حاکم ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے۔ اور ان کی بیٹیاں اپنی خدمت  
 کے لیے زندہ رکھتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلے میں ان تدابیر اور

اوصاف کا ذکر ہے جن کی بدولت بنی اسرائیل کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی۔  
غور کرنے والوں کے لیے مشتے نمونہ از خروارے یہ چند اشارات  
کافی ہیں۔

حقیقی ترقی اور کامیابی کے لیے جن اوصاف اور جس ایثار اور قربانی کی ضرورت  
ہو ان کا سنگ بنیاد دوا اور صرف دوا ہی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ خود دنیا کی تاریخ  
گواہ ہے کہ قومی ترقی میں ہمیشہ صرف ان ہی دو قوتوں سے کام لیا گیا ہے۔ یا تو  
مذہب یا حسب وطن۔

مولانا شبلی نے اس صداقت کو اپنے مخصوص طرز میں نہایت خوبی سے نظم کیا ہے  
تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو  
یا کوئی جذبہ دینی تھا کہ جس نے قوم میں  
ہو یہ وہ قوت پر زور کہ جس کی ٹکر  
اس کی زد کھا کے لرز جاتی ہے بنیاد میں  
یہ اسی کا تھا کہ شتمہ کہ عرب کے بچے  
وہ اُلٹ بیٹے تھے دنیا کا مرقع دم میں  
اُس کی برکت تھی کہ صحراے حجازی کی سمو  
یہ اسی کا تھا کہ شتمہ کہ عرب کے رہن  
یا کوئی جاذبہ ملک و وطن تھا جس نے

دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار  
کر دیا ذرّہ افسردہ کو ہرنگ شرار  
سنگ خار کو بنا دیتی ہے ایک مشت غبار  
اس سے ٹکر کے بکھر جاتے ہیں اوراق دیار  
کھیلنے جاتے تھے ایوان گہر کسری میں شکار  
جن کے ہاتوں میں ہا کرتی تھی انہوں کی جہا  
بن کئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار  
فانش کرنے لگے جبریل امیں کے ہرار  
کر دیئے دم میں قلعے علی سب بیدار



ہی اسی مری سے پیرستی احرار و وطن ہی اسی نشہ سے یہ گرمی ہنگامہ کار  
 چونکہ حقیقی قومیت کا جزو و اعظم حکومت اور سلطنت بھی ہی اس لئے  
 مسلمانوں کے جن کثیر التعداد طبقوں میں حکومت نہیں ہی ان کا جذبہ قومیت  
 ضعیف ہی اور ان میں جرمنوں فرانسسیوں۔ جاپانیوں اور ترکوں کی طرح  
 جغرافیائی وطن کی محبت کا جذبہ بھی بہت کمزور ہی نیز ”عالمگیر اخوت“ کا  
 زریں اسلامی اصول مسلمانوں کے دلی تعلق کو جغرافیائی وطن تک محدود  
 رکھنے سے مانع ہی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم کی مکہ سے مدینہ شریف کی طرف ہجرت  
 اور انصار و مہاجرین کی مدد سے صرف مذہب کی خاطر اہل مکہ (یعنی اہل  
 وطن) سے مسلسل جنگ و جدال حب وطن کے جذبہ پر مذہبی تحریک کے  
 غلبہ کا ثبوت ہی۔

فاتح اسپین اسلامی جنرل طارق کا مشہور قول کہ ”خدا کی تمام سرزمین  
 مسلمانوں کا وطن ہی“ اسی خیال کا موید ہے۔  
 طارق چو برکنارہ اندلس سفینہ سوخت گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطاست  
 ترک سبب زروے شریعت کجارت دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم  
 ہر ملک ملک است کہ ملک خدائے ماست خندید و دست خویش پشمیر برد و گفت  
 ہندوستان کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر اقبال کا شہرہ آفاق قومی ترانہ  
 ”مسلم ہیں ہم وطن ہی سارا جہاں ہمارا“ بھی اسی صداقت کی شرح ہی۔ ان

حالات اور واقعات کے زیر اثر زیادہ تر گزشتہ زمانہ میں ان کے قوائے عملی کو  
 بیدار کرنے اور تحریک میں لانے کا سبب جذبہ مذہبی ہی ہوا ہی جو قرآنی تعلیم  
 کی بدولت وجود میں آیا۔ اور اس مقدس جذبہ کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے  
 تجربہ کی بنا پر باخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید سے بہتر کوئی دوسری  
 کتاب نہیں ہے۔

مختصر کتاب اس سے زیادہ تفصیل کی محتمل نہیں ہو سکتی۔ اگر درخانہ کس است  
 ہمیں یک حرف بس است، ورنہ بقول اسیر لکھنوی

کاغذ تمام کلاک تمام اور ہم تمام  
 پر داستان شوق ابھی ناتمام ہے





## تشریح

ایک مخلص دوست نے اس کتاب کا پورا قلمی مسودہ ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور اس کی تعلیم و ہدایت کے بے نظیر اور معجز ہونے کی تو ان صفحات میں کافی وضاحت ہو گئی لیکن قرآن مجید کا یہ دعویٰ کہ اس کی ایک سورہ کی مانند بھی کوئی دوسرا کلام پیش نہیں کیا جاسکتا ہو کسی قدر تشریح طلب ہے قرآن مجید کی بعض سورتیں نہایت مختصر اور صرف ایک ایک سطر کی ہیں۔ لہذا اس کلام الہی کا چیلنج (دعویٰ) دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ کوئی بشر اس کی ایک سطر کی مانند بھی دوسرا کلام پیش نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بطور مثال مشتے نمونہ از خروارے (سورہ العصر) ملاحظہ ہو جو صرف تین آیتوں پر مشتمل ہے اور ایک سطر میں لکھی جاسکتی ہے۔

وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خَسْرٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَّصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (یعنی زمانہ کی قسم کہ انسان یقیناً ٹوٹے میں ہو مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔ اور ایک دوسرے کو حق پرستقامت کی وصیت کرتے ہیں

اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے ہیں) ارشاد ہوتا ہے کہ خود زمانہ اس کا شاہد ہے کہ وہ انسان ضرور نقصان اور خسارہ میں ہے گا جس نے ان چار اصولوں پر عمل نہیں کیا جو اس سورۃ میں بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) سب سے اول تو ایمان اور (۲) اس کے ساتھ عمل صالح کی ضرورت ہے۔ بغیر عقیدہ کی مضبوطی اور پختہ ایمان کے کوئی بڑا کام انجام نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن صرف عقیدہ ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے مطابق احکام الہی پر عمل کرنا بھی نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ انہیں احکام و ہدایات پر عمل کرنے سے ہر قسم کی دینی اور دنیاوی ترقیاں حاصل ہو چکی ہیں اور آئندہ ہو سکتی ہیں۔ لیکن باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ صرف یہ دو باتیں انسان کو نقصان اور خسارہ سے محفوظ نہیں رکھ سکتیں۔

ابتدائی دو اصولوں کی پیروی سے صرف انفرادی ترقی کی تکمیل تو ہو سکتی ہے۔ لیکن کامل ترقی کے لیے اجتماعی اور جمہوری ترقی بھی لازم ہے۔ لہذا حکم ہوتا ہے کہ انفرادی ترقی کے دونوں اصولوں پر عمل کرنے کے بعد (۳) ایک دوسرے کو حق پر استقامت کی ہمایش اور تاکید کرنا بھی لازمی امر ہے۔ اور یہ تیسرا اصول ترقی ہے۔ اور یہ بھی کافی نہیں بلکہ اس کے بعد چونکہ حق پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے

بہت سی مخالفتوں کا مقابلہ ناگزیر ہوتا ہے لہذا ضروری ہے کہ چوتھے اصول پر بھی عمل کیا جاوے اور وہ یہ ہے کہ (۴) ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی جاوے۔ صبر سے یہ مراد ہے کہ حق پر قائم رہنے کی وجہ سے جو جو مصائب پیش آئیں ان کے مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیے اور پیش آمدہ مخالفتوں اور تکلیفوں سے پریشان ہو کر حق کی حمایت نہ چھوڑنا چاہیے۔

جب تک ان چاروں اصول پر عمل نہ ہوگا انسان ترقی نہیں سکتا چنانچہ مختص الوقت قومی اجتماع کا نفرینیں اور جلسے وقتاً فوقتاً اسی ضرورت سے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اور ہفتہ وار اور سالانہ خطبوں اور مواعظ کا بھی یہی منشا ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ترقیوں کے تمام ضروری اور اہم اصول صرف ایک سطر میں قرآن مجید نے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ میں بیان کر دیئے۔

دنیا کی تمام تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کر جائیے۔ اور بنی نوع انسان کی ترقیوں کے اصول تلاش کیجئے مگر ان چار اصولوں سے بڑھ چڑھ کر ہرگز کوئی نیا مشورہ نہ ملے گا۔ اگر دنیا بھر کی کتابیں جمع کی جائیں تو اس فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کیے ہوئے کمال ترقی حاصل کرنے کے یہ جامع اور مانع اصول ان میں ڈھونڈے نہ ملیں گے۔ اور یہی قرآن مجید

کی تعلیم کا اعجاز ہے۔ اور اسی اعجاز کی بنا پر ساری دنیا کو چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر ہو سکے تو قرآن مجید کی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی مانند ہی کوئی بشری کلام پیش کرے۔

یہ ایک نہایت مختصر نمونہ ہے اس پاک قرآنی تعلیم کا جو بنی نوع انسان کے لئے ایسا مکمل قانون پیش کرتی ہے جس کی مدد سے انسان انتہائی روحانی اور مادی ترقی کر سکتا ہے اور جس کی بدولت ایک خشک جزیرہ نما کے باشندے نہ صرف کامل خدا پرست اور روحانی پیشوا بن گئے بلکہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ہو کر انھوں نے علم و فضل کی روشنی تمام عالم میں بھیلادی۔

نوٹ: شہسوار، حق پر استقامت کے ساتھ صبر کی تلفیق کا اس طرح وابستہ کیا جانا اس گہری حقیقت پر مبنی ہے کہ حق کی حمایت کرنے والوں کو شدید مخالفتوں سے ضرور مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور حقیقت میں یہی مقابلہ اور کشمکش حق پرستوں کی قوتوں میں ترقی اور اضا<sup>ع</sup>فہ کا باعث ہوتا ہے۔ جس طرح کامیاب شہسوار وہی بن سکتا ہے جو شیر ترین گھوڑے پر قابو پاسکے۔ اسی طرح مخالفتوں کی شدید مخالفتوں کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کرنا ہی حقیقی کامیابی اور ترقی کا راستہ ہے۔ اور یہی صداقت شیطان

یافس امارہ یا قوائے بہیمیہ کے وجود کی مصلحت ظاہر کرتی ہے شیطانی طاقتوں سے مقابلہ کرنے اور ان پر فتح پانے سے ایمانی قوتوں کو عروج اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ اگر کوئی مخالف قوت سامنے نہ ہو اور مقابلہ کی کبھی نوبت نہ آئے تو اپنی طاقت قائم رکھنے اور اس کو بڑھانے کی کوئی ترغیب باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ پہلوانوں کی کشتیوں کے جنگ اور کرکٹ ہاکی اور فٹ بال کے روزانہ میچ اسی حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں۔

(۲) چونکہ مطبع میں اس کتاب کی کتابت ختم ہو چکی تھی اور بیچ میں اضافہ مضمون کی گنجائش نہ تھی اس لیے اپنے دوست کے مشورہ کے مطابق اس مضمون کا تتمہ کے عنوان سے آخر میں اضافہ کیا گیا حقیقت میں یہ اضافہ چھٹے باب کا جزو ہے جس میں قرآن مجید کی تعلیم و ہدایت کا ذکر ہوا ہے۔ اور اس کے آخر میں چھپنا چاہیے تھا۔

مولف



# مطبوعہ نظامی پریس ہریانہ

(محمد اجدالین ایف آر ایس پرنٹر)

# مطبوعہ نظامی پریس ہریانہ

(محمد اجدالین ایف آر ایس پرنٹر)